www.shibliinternational.com March 2019

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

Vol-2, Issue-13

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

-/10 روپے

مارچ Mar :2019

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد Vol:2 ۔شمارہ: Issue13

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 15
سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی باتیں	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	عباداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ (قسط:۱۰)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ملت کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں	مولوی صفوۃ الرحمٰن	۱۰
۵	قرآن مجید کا ایک بھلایا ہوا حق	مفتی شکیل احمد رحمانی	۱۲
۶	متعلقاتِ شبلی پر ایک نظر	ڈاکٹر خالد ندیم	۱۴
۷	غزل	عبداللہ کمال	۱۸
۸	اردو افسانہ اور محشر عابدی (قسط۲)	ڈاکٹر رفیعہ شیم	۱۹
۹	حیدرآباد کی اردو صحافت اور روزنامے	ابوہریرہ یوسفی	۲۲
۱۰	غزل	پروفیسر مظفر علی شہ میری	۲۵
۱۱	منصور ہند صوفی سرمد شہید۔۔۔کتاب زیست کے چند گم شدہ اوراق	مولانا افتخار رحمانی	۲۶
۱۲	زید انوار محمد فکر ونظر کے آئینہ سے	ڈاکٹر مختار احمد فردین	۳۱
۱۳	علامہ شبلی اور مدارسِ اسلامیہ کا نصاب ونظام درس	احمد نور عینی	۳۳
۱۴	غزل	عثمان شاہین	۳۵
۱۵	سائنس کے کرشمے (نظم)	مولانا انصار احمد معروفی	۳۷
۱۶	حضرت سید شاہ میر شاہ محی الدین ثانی قادریؒ	حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی	۳۸

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی...... الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...... الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)...... **علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد...... **محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد...... مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمر الدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

اپنی باتیں

دہشت گردی کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے اور اس پر جتنی بھی سختی کی جائے روا ہے۔ ۱۴؍فروری ۲۰۱۹ء کو پلوامہ کشمیر میں ہمارے فوجی جوانوں سے بھری ٹرک آنِ واحد میں بارود سے ڈھیر ہوگئی۔ تقریباً پچاس فوجی جوان لقمۂ اجل ہوگئے۔ ادارہ انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے ارکانِ خاندان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔

کسی بھی چیز کو ختم کرنے یا راہِ راست پر لانے کے لیے دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، ایک داخلی، دوسرے خارجی، حکومت ہند کو چاہئے کہ دہشت گردوں اور دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے خارجی جو بھی طریقہ اپنانا چاہے، ٹھوس طریقے سے اپنائے، اپنے جاسوسی نظام، اسلحہ جات ٹکنالوجی وغیرہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شرپسندوں کے سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دے، تاکہ پھر دوبارہ کوئی پلوامہ حملہ وجود میں نہ آسکے۔ یہ دعویٰ ایک کے بدلے دس لائیں گے، یہ غلط ہے، بلکہ ہمارا اپنا ایک بھی نہیں ہونا چاہئے اور جو ہماری طرف دراندازی کرے، اسے ایسا سبق دیا جائے کہ دوبارہ کسی کی ہمت نہ ہو۔

اور داخلی طور پر جو ملک میں اقلیتوں کے ساتھ ہورہا ہے، اس سے قلبی اور فکری مخالفت تیزی سے بڑھ رہی ہے، ملک میں چھوٹی بڑی چنگاری کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلی ہوئی ہے، ان چنگاریوں کو عدل و محبت کے پانی سے بجھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک مختلف مذاہب، مختلف رنگ و نسل، تہذیب و ثقافت کا گلدستہ ہے اور اس ملک کی خوبصورتی اسی میں ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی کمزور ہے تو اس پر خاص توجہ ہونی چاہئے، تاکہ ملک کا تانا بانا مضبوط رہے۔

گذشتہ کچھ مہینوں اور دنوں سے میڈیا نے بے سروپا، افراط و تفریط خبروں کو نشر کرکے صحافت کے قد کو اس طرح گرادیا ہے کہ ایک کم پڑھا لکھا آدمی بھی فوراً یہ الزام لگادیتا ہے کہ خبریں جھوٹی اور ناپاک سیاست کا حصہ ہیں۔ پلوامہ کی تکلیف دہ اور بزدلانہ حرکت کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی میڈیا نے جو احمقانہ حرکت کی ہے، اس سے دونوں ملکوں کی سطحی صحافت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، حالانکہ میڈیا کو غیر جانب دار، مناسب حق کی ترسیل اور امن و آشتی کی بات کرنی چاہئے۔

معزز قارئین! ہم ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کی ایک جلد (یعنی کامیابی کا ایک سال) خدا کے فضل اور آپ لوگوں کے تعاون سے مکمل کرچکے ہیں۔ ادارہ آپ کے تعاون کا بے حد شکر گزار ہے۔ امید ہے کہ آپ کا تعاون مداومت کے ساتھ جاری رہے گا۔ ہماری ویب سائٹ www.shibliinternational.com پر جلد اول کے بھی ۱۲؍شمارے موجود ہیں۔ نئے قارئین، اس سے استفادہ کرسکتے ہیں

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

عباداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

زید بن خالدؓ جہنی ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے) نماز کا وقت آیا تو آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں، پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بہ تدریج چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی، خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپؐ نے سورہ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا کہ آپؐ سو آیتوں تک پڑھیں گے لیکن آپؐ ان کو پڑھ کر آگے بڑھے، میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپؐ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ آپؐ نے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ آپؐ رکوع کریں گے لیکن آپؐ نے فوراً ہی سورہ نساء شروع کر دی، یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ آل عمران شروع کی (یہ سورتیں مل کر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپؐ قرأت کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے، اس کے بعد آپؐ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی۔

میدانِ جنگ میں یادِ الٰہی: عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرِ پیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور دار وگیر برپا ہوتا، آپ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینان کے ساتھ دعا وزاری اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے، سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن سپہ سالار کی پیشانی زمینِ نیاز پر ہوتی، بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی، معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائدِ اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالمِ اسباب کے لحاظ سے گو آپؐ نے اصولِ جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسہ اسبابِ کائنات سے ماورا قادرِ مطلق کی ذات پر تھا، بدر میں دو صحابیؓ حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے" بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور آپ خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں، "خدایا! اپنا وعدۂ نصرت پورا کر" محویت اور بے خودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر نہیں ہوتی، کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا" اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدانِ جنگ سے حاضرِ خدمت ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ غزوۂ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے لیکن آپؐ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو:

ترجمہ: خدا ہمارا آقا ہے، تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے۔ (سیرۃ النبیؐ، ج:۲،ص:۲۰۷/۲۰۸)

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

مولانا سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء) جانشینِ شبلی ہیں، وہ علامہ شبلی کے سب سے لائق شاگرد تھے۔ تصنیف وتالیف کے لئے علامہ نے ان کی تربیت کی تھی، خاندانی طبابت کے پیشے سے بچا کر علمی دنیا کا سرتاج بنایا اور ندوہ کے جلسہ میں جب ہندوستان اور مصر کے عمائدین موجود تھے اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا، یہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا کہ وہی گلشن شبلی کے مالی ہوں گے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان، شبلی کی جانکنی میں ان کے سراہنے جب آنسو بہا رہے تھے استاذ نے اشارے سے تمام کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کے لئے کہا اور پھر خود سیرت سیرت کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

استاذ کی خواہش کے مطابق سید صاحب نے تمام کام چھوڑ دیئے اور آستانہ شبلی پر آکر بیٹھ گئے اور سیرت کی تکمیل اپنی زندگی کا مشن بنالیا اور پورا ہی کر کے دم لیا، سیرت کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی اب تک کتاب کے بے شمار ایڈیشن ملک وبیرون ملک سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں تین دیباچے اور ایک مقدمہ شامل ہے، مقدمہ علامہ شبلی کے قلم سے ہے اور اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہئی سے اس کا عربی ترجمہ شائع ہوا اور عربوں میں مقبول ہوا، دو دیباچے مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں، پہلا دیباچہ طبع اول پر لکھا گیا تھا، اس میں سیرۃ النبیؐ کی عظمت، شبلی کی وصیت کے مطابق تدوین واشاعت کی تفصیل ہے، لکھتے ہیں:

> ''سیرت نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے آج ۷/ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاذ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا الحمدللہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں''۔ (سیرۃ النبی ج ا ص ۷، اعظم گڑھ طبع جدید، ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کو اس کی اشاعت کی کتنی حسرت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی'' اس حسرت پر شاگرد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جاں کاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو آستانہ نبوتؐ پر وہ خود نہ چڑھا سکا''۔ (ص ۷)

اس کے بعد سید صاحب نے سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے لئے علامہ کی کوششوں کا ذکر کیا ہے، حتمی ارادے کے بعد پچاس ہزار کی بڑی رقم کا اعلان اور نواب بھوپال بیگم سلطان جہاں

(۱۸۵۴ء-۱۹۳۰ء) کی اعانت وذمہ داری کی تفصیل سپرد قلم کی ہےاور لکھا ہے کہ:

''فرماں روا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیے ہیں آئندہ مورخ غالبًا اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑی ہستی ہے''۔ (ص۷)

علامہ شبلی کی وفات کے بعد بھی بیگم سلطان جہاں نے اپنی زر افشانی کا سلسلہ فیض جاری رکھا، سید صاحب نے اس کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ پھر سیرت نبویؐ کے مسودہ شبلی کی تربیت وتدوین کے مسائل کا ذکر ہے اور انھوں نے اس میں جو اصلاحات وتصحیحات کی ہیں ان کی تفصیل پیش کی ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ اگر میں کہیں ایک حرف بدلتا تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا۔

چار برس بعد اس کا دوسرا ایڈیشن کتابی سائز میں شائع ہوا اور اس میں جو کتابت وغیرہ کے اغلاط رہ گئے تھے انھیں درست کیا، اس پر سید صاحب نے ایک صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے، اس کا آغاز ان لفظوں میں ہوا ہے:

''سیرۃ نبویؐ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوگئے، اس اثنا میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ خاکساران دار المصنفین کے لئے فخر ونازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدر دانوں نے اس کو جان ودل سے خریدا اور امراء ووالیان ممالک نے اس کی خدمت کو سعادت دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدر شناسی کی''۔ (ص۶)

یہی نہیں یہ دوسرا ایڈیشن اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ مختلف طبقات کے اہل علم نے اسے میزان نقد میں جانچا اور پرکھا، سید صاحب نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین وتحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ وسیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص ومحبت سے انھوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا'' (ص۶)

سید صاحب کے قلم سے تیسرا دیباچہ طبع چہارم پر لکھا گیا ہے، پہلے سیرت کی مقبولیت پر مصنف اور جامع کی طرف سے اللہ کا شکر ادا کیا ہے، اس کے بعد سیرت میں اغلاط کی تصحیح اور مسودہ سے مبیضہ اور دوسری طباعتوں کے اغلاط کی درستگی وغیرہ کی تفصیل قلم بند کی ہے، ہندسوں کی بعض غلطیاں راہ پاگئی تھیں انھیں درست کیا گیا ہے، اس طرح علامہ شبلی کے پیش نظر جو قلمی نسخے تھے اور اب سید صاحب کے پاس ان کے مطبوعہ نسخے آگئے تو ان سے بھرپور استفادہ کرکے ان کے حوالہ دیئے گئے اور ضروری اضافات بھی کئے گئے، اس ایڈیشن میں جامع سیرت نے جو کچھ کیا ہے اسے ۸/ شقوں میں بیان کیا گیا ہے، ان مقدمات سے جو سب سے بڑی بات سامنے آئی ہے وہ سید صاحب کی اپنے استاذ سے بے پناہ محبت اور خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت بے پایاں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیرۃ النبیؐ کی دوسری جلد شائع ہوئی اس پر سید صاحب کا دیباچہ ہے، اس دیباچہ میں پہلی جلد کی مقبولیت کا

ذکر ہے، پھر جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے نقصانات دکھائے ہیں کہ کاغذ وطباعت کی گرانی کی وجہ سے سیرت تاخیر سے شائع ہورہی ہے۔ پھر اس جلد کے مشمولات کا ذکر کیا ہے:

''پہلی جلد نبوت کے پر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست وسہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق وشمائل شریفہ اور ازواج مطہرات واولاد کرام کا تذکرہ ہے''۔ (جلد دوم ص ۹)

اس کے بعد مسودہ سیرت اور اس کے ناتمام حصوں کی تکمیل کا ذکر ہے وہ جو ابواب اضافہ کرنا چاہتے تھے شبلی کے قلم سے اس کے متعلق یادداشت ملی تو اس کے مطابق اضافے کئے، اسی طرح اخلاق کے باب میں بھی بہت سے عنوانات سادہ تھے اور سید صاحب نے انھیں لکھا، استاذ سے اپنی تحریر کو ملانے سے بچانے کے لئے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر دی گئی ہیں۔ (ص ۱۰)

سیرت کی جلد سوم سید صاحب کے قلم سے ہے اس میں علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے البتہ جلد چہارم جو منصب نبوت پر ہے علامہ کا ایک جگہ ذکر ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع میں کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے عرب جاہلیت کے مذہبی اخلاقی حالات کے پچیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت ہوئی ہے اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں''۔ (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۴، اعظم گڑھ طبع جدید ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کے شاگردوں کی تعداد کم نہیں مگر کوئی سید سلیمان نہیں وہ اپنے استاذ کے ذکر کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے، سیرۃ النبیؐ جلد پنجم شائع ہوئی تو اس کے دیباچہ میں سیرت کی ترتیب وتدوین کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو تھا، ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے''۔ (ص ۳)

اس کے بعد ان کے دو خطوط کے اقتباسات دلائل میں نقل کئے ہیں، پھر سلسلہ سیرت کے حسن قبول کا ذکر کیا ہے اور امرائے اسلام کے عنوان سے ریاست بھوپال کے تعاون کا ذکر ہے اور اس بات کا بھی ذکر ہے کہ بیگم سلطان جہاں کے جانشین نواب حمید اللہ خاں نے اسی طرح قدردانی فرمائی ہے جس طرح سرکار عالیہ نے کی تھی۔ علامہ شبلی نے بیگم سلطان جہاں کی فراخدلی اور امداد سیرت کے لئے ایک قطعہ کہا تھا وہ قطعہ بھی سید صاحب نے نقل کیا ہے، وہ قطعہ یہ ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے

رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

علامہ شبلی نے جب وفات پائی تو بیگم نے بڑے دردلہجہ سے کہا تھا کہ فقیر بے نوا تو چل بسا اب سلطان کی باری ہے''۔ (ص ۵)

آخر میں سید صاحب جن کی عمر اس وقت پچاس سال ہوچکی تھی اس کا ذکر کیا ہے اور اسی سلسلہ کی تکمیل میں خاک ہوجانے کی تمنا کی ہے۔

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابرؔ۔حیدرآباد

ملت کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں

دنیا میں عذابِ الٰہی نازل ہونے کے وجوہات

رب کا اٹل قانو یہ ہے کہ وہ کتاب اور رسول کو مبعوث کر کے انسانوں کو ان کے ابدی انجام سے باخبر کردیتا ہے۔علم وخبر کا یہ سامانِ ہدایت فراہم کردینے کے بعد بھی اگر وہ اپنی بے خبری کی روش پر جمے رہیں تو بھی عذاب نازل نہیں فرماتا بلکہ مختلف طریقوں سے خبردار ہونے کے اسباب پیدا کرتا ہے، جب بھی یہ خبردار ہونے کی بجائے خبردار کرنے والوں کو نقصان یا تکلیف پہنچانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں تو ان کو مختلف طریقوں سے عذاب میں مبتلا کردیا جاتا ہے، بالآخران کو ہلاک کردیا جاتا ہے۔

قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعاویذیق بعضکم باس بعض (انعام:۶۵)

’’اے نبی آپ سنا دیجئے کہ اگر تم اپنی مخالفت سے باز نہ آوگے تو تمہارا رب اس بات کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے کہ تمہارے اوپر سے یا تمہارے نیچے سے تم پر عذاب بھیج دے اور حق کی مخالفت کرنے کے لیے تم نے جو گروہ بندی کرلی ہے اوسکو توڑ کر علیحدہ علیحدہ گروہ میں تقسیم کردے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے طاقت کا مزہ چکھادے‘‘۔

واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنٰھا تدمیرًا (اسریٰ)

’’بستی والوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ ہم اسی وقت کرتے ہیں جبکہ ان کے رہنما وخوشحال لوگ خبردار کرنے کے باوجود نہ صرف نافرمانی کرتے ہیں بلکہ حق سے خبردار کرنے والوں کے درپے آزار ہوجانے سے وہ مستحق عذاب قرار پا جاتے ہیں تب ہم اس بستی کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں‘‘۔

وما کان ربک مھلک القریٰ حتیٰ یبعث فی امھا رسولًا یتلوا علیھم ایٰتنا، وما کنّا مھلکی القریٰ الّا واھلھا ظٰلمون (القصص)

’’اور تیرے رب کا یہ قانون نہیں کہ لاعلم و بے خبر بستیوں کو ہلاک کردے جب تک کہ ان کے علاقہ میں پیغمبر نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور صرف اسی بستی کو ہم ہلاک کرتے ہیں جو خبردار کرنے کے باوجود اپنے ظلم سے باز نہیں آتے اور خبردار کرنے والوں کے درپے آزار ہوجاتے ہیں‘‘ اس معاملہ کا الٰہی قانون یہ ہے کہ اہلِ باطل، پیغمبر اور ایمان والوں کو جب تبلیغ دعوت پیش کرنے سے روکنے کے لیے جان ومال کو تباہ کردینے کی دھمکی دیتے ہیں تب بھی انبیاء علیہم السلام اور اہلِ ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی دعوت پیش کرنے سے باز نہیں آتے (اللہ پر بھروسہ کرنے میں اللہ سے دعا اور حفاظت ودفاع کا جو سامان بھی میسر ہے چاہے وہ کتنا ہی حقیر ترکیوں نہ ہو تیار کرنا اور تیار رکھنا شامل ہے) تو اہلِ باطل اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو تب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور اہلِ ایمان کو یہ خوشخبری دی ہے

کہ ڈرو مت! ان ظالموں کو نہ صرف ہلاک کردوں گا بلکہ تم کو زمین پر آباد کروں گا، اللہ کے یہ وعدے صرف پیغمبروں تک محدود نہیں بلکہ ہر اس ایمان والے کے لیے بھی ہے جو اللہ کی بات پہنچانے میں خوف نہیں کرتا بلکہ اس کو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ میں اپنے رب کے سامنے اپنے فرض کو پورا کرنے والوں میں شمار ہونے سے نہ رہ جاؤں، اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی ہے، **ولنصبرن علی ماآذیتمونا** (ابراہیم:۱۲) ''البتہ ہمارے اس کام کی وجہ سے جو بھی تکلیف ونقصان تم ہم کو پہنچاؤ گے، بتوفیق الٰہی ہم اس پر صبر کریں گے'' بے قصور افراد کو قتل کرنا یا نقصان پہنچانا پیغمبروں کے اسوہ کے موافق ہے یا خلاف غور کرلیا جائے۔

دوسرے رجم کرنے کی دھمکی پورنوحؑ نے دعا کی **فدعا ربہ انیّ مغلوب فانتصر** (القمر) ''پس (نوحؑ) نے دعا کی اے میرے رب قوم سے مقابلہ کرنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں، اس لیے تو ہی میری مدد فرما'' پھر اپنی قوم کو یوں جواب دیا، **یٰقوم ان کان کبر علیکم مقامی وتذکیری باٰیات اللہ فعلی اللہ توکلت فاجمعوا امرکم وشرکاء کم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃً ثم اقضوا الیّ ولاتنظرون** (یونس) اے میری قوم! میرا تمہارے ساتھ رہنا اور اللہ کی باتوں کے ذریعہ نصیحت کرنا اگر تمہارے لیے ناقابل برداشت ہوگیا ہے تو میں اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں، پس تم سب اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے خلاف ایسی تدبیر کرنا طے کرلو جس کے ناکام ہونے کا تم کو بعد میں افسوس نہ کرنا پڑے پھر اس کو کر ڈالو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو''۔

قوم (اہلِ قریش) کی سازش پر اسی قسم کا جواب نبی کریمؐ نے بھی دیا ہے، **الھم ارجل یمشون بھا، ام لھم اید یبطشون بھا، ام لھم اعین یبصرون بھا، ام لھم اذان یسمعون بھا، قل ادعوشرکاء کم ثم کیدون فلاتنظرون** (اعراف)

''کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھ رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟ اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ تم اپنے شریکوں کو بلالو پھر سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو'' جب قوم نے آپ کو قتل کرنے کی سازش کرلی تو اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا اور آپؐ مدینہ جانے کے لیے اسی دن خفیہ طور پر مکہ مکرمہ سے نکل گئے۔

اس آیت کے آخری حصہ میں نبی کریمؐ نے اپنی ذات کو نقصان پہنچانے کا قوم کو یہ جو چیلنج کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکر ہے جو محض روایت کی بناء پر نبیؐ پر جادو ہونے کو مانتے ہیں۔ دنیا دارالاسباب میں مادی وٹھوس اسباب وذرائع کو استعمال واختیار کیے بغیر نفع ونقصان ہونے یا پہنچانے کا وہم شیطان کا پیدا کردہ ہے۔ ایسا ہی چیلنج سورہ ہود میں ہودؑ نے اپنی قوم کو دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے **ان نقول الا اعترٰک بعض الھتنا بسوءٍ، قال انیّ اشھد اللہ واشھدو انیّ بریء ممّا تشرکون، من دونہ فکیدونی جمیعًا ثم لا تنظرون** ''ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تم کو نقصان پہنچایا ہے، ہودؑ نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو قطعی بیزار ہوں (یعنی یہ مردہ ہیں نہ دنیا والوں کی پکار سن سکتے ہیں اور نہ ان کی کوئی بگڑی بنا سکتے ہیں بلکہ ان کی مغفرت کے لیے تو دنیا والے دعا کرسکتے ہی) اللہ کو چھوڑ کر (جن کی تم عبادت کرتے ہو) وہ اور تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی جو بھی تدبیریں کرنا چاہتے ہو کرلو اور مجھے مہلت نہ دو'' ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تو اللہ نے **قلنا ینار کونی بردًا وّ سلٰمًا علی ابراھیم** (الانبیاء) ''ہم نے حکم دیا اے آگ! تو ٹھنڈی اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے''

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا سا ایمان پیدا
(بہ حکمِ الٰہی) آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستان پیدا

مفتی شکیل احمد رحمانی۔ سکندرآباد، حیدرآباد

قرآن مجید کا ایک بھلایا ہوا حق

وقال الرسول یا رب ان قوی اتخذ وا ھذا القرآن مھجوراً

ترجمہ: اور رسول محمد ﷺ کہیں گے کہ اے میرے پروردگا میری قوم نے اس قرآن کو ترک کردیا تھا حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو بند کر کے رکھ دیا نہ اس کی تلاوت کی پابندی کی نہ اس کے احکام میں غور کیا قیامت کے روز قرآن اس کے گلے میں پڑا ہوا آئے گا اور اللہ تعالی کی بارگاہ میں شکایت کرے گا کہ آپ کے اس بندے نے مجھے چھوڑ دیا تھا اب آپ میرے اور اس کے معاملہ کا فیصلہ فرمادیں۔ قرآن مجید کے بہت سارے حقوق ہیں مثلاً اس کی تلاوت اس کے معنی ومفہوم کو سمجھنا اس کا احترام اس کے حلال وحرام کو حلال وحرام جاننا اس پر عمل کرنا نیز اس کے علاوہ قرآن کا ایک حق اور بھی ہے ایسا حق جس کی طرف ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا اور جس کو ادا کرنے میں ہمارے سینہ میں کوئی عزم پیدا نہیں ہوتا، یہ حق ہے اللہ کی کتاب کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا قرآن کریم کی ایک صفت **"ھدی للناس"** ذکر کی گئی ہے جس کا مطلب ہے کہ جو لوگ ہدایت سے محروم ہیں ان تک یہ کتاب پہنچائی جائے اور کلمہ گو اس کے الفاظ ومعانی سے آشنا ہوں انہیں بھی یہ کتاب حرفاً حرفاً پڑھائی جائے یہ کتاب ھدایت اللہ تعالی کی امانت ہے اس امانت کا یہ حق ہے کہ اسے پوری انسانیت تک پہنچائی جائے خود قرآن میں چھ ہزار سے زائد آیتیں ہیں ان میں پانچ ہزار پانچ سو آیتیں براہ راست یا بالواسطہ دعوت دین سے متعلق ہیں تبلیغ قرآن کے فریضہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا اے رسول جو کتاب آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے اسے پہنچادیجئے اگر آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تو آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا، رسول اللہ ﷺ کو اس ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی راتوں کو انسانیت کی ھدایت کے لئے خدا کے سامنے رونے گڑگڑانے اور التجا کرنے میں گزاری اور دن بندگان خدا کو اللہ کی طرف بلانے اور بندوں کو خدا سے جوڑنے میں صرف کیا، اسی لئے آپ ﷺ نے طائف میں پتھر کھائے اور لہولہان ہو گئے، جنگ احد میں چہرہ مبارک کا زخمی ہونا گوارہ فرمایا، شعب ابی طالب میں بھوک پیاس کی تکلیف اٹھائی مکہ سے تلواروں کے سایہ میں مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، آپ ﷺ نے خود فرمایا کسی نبی کو اتنا دھشت میں مبتلا نہیں کیا گیا جتنا مجھ کو دھشت میں مبتلا کیا گیا، آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر مٹی ڈالی گئی، گالیاں دی گئیں، حالت نماز میں آپ ﷺ کی گردن مبارک میں کپڑا ڈال کر گھسیٹا اور گلا گھونٹا گیا حالت سجدہ میں آپ ﷺ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال کر آپ کا مذاق اڑایا گیا، آپ ﷺ کے عم محترم کا کلیجہ چبایا گیا اور آپ ﷺ کی صاحبزادی کو طلاق دی گئی ان ساری آزمائشوں ابتلاؤں اور مخالفتوں اور عداوتوں سے آپ ﷺ کیوں گزرے اسی لئے کہ حق رسالت کی یہ ذمہ داری ادا ہو، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقعہ سے ایک لاکھ صحابہؓ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا **"ألا فليبلغ الشاھد الغائب"** سنو میرے لائے ہوئے دین کو ہر حاضر غائب تک پہنچادیئے چنانچہ صحابہ آپ کے مشن اور آپ کی دعوتی فکر کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے، امت محمد ﷺ کو دیگر امتوں پر جو تفوق وامتیاز حاصل ہے اس کی بنیادی وجہ فریضۂ دعوت ہے خاتم النبیین ﷺ پر نبوت ختم فرما کر اللہ تبارک وتعالی نے قیامت تک آنے والی انسانیت کو دین کا پیغام پہنچانے کے لئے

اس امت پر دعوت کی عظیم ذمہ داری ڈالی ہے چودہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ جس جس دور میں مسلمان دعوتی ذمہ داری نبھاتے رہے ،وہ اس تاریخ کا روشن اور تابناک دور رہا، چہار دانگ عالم میں ان کا ڈنکا بجتا رہا،لیکن جب مسلمان اپنے فرض منصبی میں کوتاہی کرنے لگے اور ان کی زندگی سے دعوت کا عمل اٹھ گیا تو پھر ذلت کے عمیق گھڑھوں میں جا گرے''**اخرجت للناس**'' جس امت کی شان تھی اور **امر بالمعروف ونھی عن المنکر** جس امت کا طرۂ امتیاز تھا وہ خواہ کہیں اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں غیر محفوظ و غیر مامون ہو گئے اس کی وجہ صرف اور صرف دعوت الی اللہ سے بے اعتنائی اور لا پرواہی ہے اسی لئے مفسرین رقمطراز ہیں کہ غیر مسلموں اور ظالموں کے تسلط سے بچنے اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کا واحد علاج یہی دعوت الی اللہ کا کام ہے صحابہ و تابعین نے دعوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، دعوت ان کی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے کیوں نہ منسلک تھا وہ تو پہلے داعی تھے،اس لئے بھی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ یہ حدیث ہمیشہ پیش نظر رکھی تھی کہ ''اے علیؓ اگر آپ کی کوشش سے اللہ تعالیٰ کسی ایک کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے''حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ ''**امر بالمعروف ونھی عن المنکر**'' کا فریضہ ادا کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی جابر بادشاہ مسلط فرما دے جو نہ تمہارے بڑوں کی تعظیم کرے اور نہ تمہارے چھوٹوں پر رحم کرے تمہارے نیک لوگ اس کے خلاف بد دعائیں کریں تو قبول نہ ہو تم مدد کے لئے پکارو تو تمہیں مدد نہ ملے مغفرت چاہو تو تم کو مغفرت حاصل نہ ہو۔

علامہ عبد الرؤف مناوی فرماتے ہیں بخدا دنیا میں دو باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے یا تو تمہاری طرف سے ''**امر بالمعروف اور نھی عن المنکر**'' کا فریضہ موجود رہے گا یا نہیں،تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب الیم آئے گا دور حاضر کے مسلمان بھی دعوت الی اللہ کے فریضہ کو اپنا کر اپنے مسائل و مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ دعوت کے سوانحات ورفعت کے سارے راستے بند ہیں اگر قیامت کے دن کوئی دعوی کر دے کہ میرے اس پڑوسی کے پاس آپ کی کتاب تھی اور اس نے ہم تک نہیں پہنچایا اور کچھ غیر مسلم کھڑے ہو جائیں کہ ہماری دکان اور کارخانہ میں فلاں فلاں مسلم بھائی کام کیا کرتے تھے اور بظاہر ہمارا کاروبار اس کے لئے رزق کا ذریعہ تھا لیکن کبھی اس نے ہم تک آپ کی بھیجی ہوئی سوغات نہیں پہچائی ،اگر غیر مسلم مزدور کھڑے ہو جائیں کہ ہم نے گاڑھے پسینے بہائے ان مسلمانوں نے کبھی دوزخ کے آتش کدہ کی طرف ہمارے بڑھتے قدم کو روکنے کی کوشش نہیں کی ،اور اگر اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنی امت سے سوال کر بیٹھیں کہ جس کتاب کو پہنچانے کے لئے ہم نے پتھر کھا ئے جان قربان کرنے کو قبول کیا تم نے اس کے لئے اپنی زبان اور اپنی زندگی کا تھوڑا سا وقت بھی خرچ نہیں کیا تو سوچئے خدا اور اس کے رسول کے سامنے ہم لوگ کس قدر شرمسار ہوں گے اور کیوں کر ان سوالات کے جوابات دے سکیں گے؟؟

بقیہ: ص:۱۸ کا

یعنی 'تصانیف شبلی کے تراجم'، 'باقیات شبلی، ایک مطالعہ' اور 'حیات شبلی' ایک مطالعہ۔ ان مضامین میں سے پہلا مصنف کی تحقیقی شان کا عکاس ہے۔

'تصانیف شبلی کے تراجم' میں مضمون نگار دنیا بھر کی اہم وغیر اہم زبانوں میں تصانیف شبلی کے تراجم کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دیدہ ریزی کسی عاشق صادق ہی سے ممکن تھی، چنانچہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو عاشق شبلی کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ مصنف نے شبلی کی نو کتب اور چار مقالات کے تراجم کی تفصیلات دی ہیں۔ تراجم کے اس تعارف کے بعد ان کا کہنا ہے کہ 'اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ (ص ۱۴۳)

ڈاکٹر خالد ندیم۔ ایسوسیٹ پروفیسر شعبہ اردو سرگودھا یونیورسٹی

متعلقاتِ شبلی پر ایک نظر

اردو کے معروف شبلی شناسوں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا ہے، جنہوں نے اپنی علمی زندگی کا زیادہ حصہ شبلی سے متعلق غور و فکر میں گزار دیا۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیفات و تالیفات کا دائرہ متنوع موضوعات پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کی زیرِ نظر تصنیف چودہ مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے بعض تحقیقی، بعض تنقیدی، بعض تجزیاتی اور بعض تاثراتی ہیں، لیکن ان سب کو شبلی سے نسبت نے یکجان کر دیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، شبلی تصانیفِ شبلی اور تصانیف بر شبلی۔

شبلی کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی حیثیات سے متعلق مضامین میں 'علامہ شبلی، ایک عاشقِ رسولؐ، اردو زبان و ادب کے ارتقا میں علامہ شبلی کا حصہ، شبلی بحیثیت مدیر، علامہ شبلی علی گڑھ میں، عالمِ اسلام میں شبلی شناسی اور عہدِ حاضر میں علامہ شبلی کی تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت شامل ہیں۔ ان میں سے آخر الذکر دو مضامین تحقیقی معیارات کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔

'عالمِ اسلام میں شبلی شناسی' سے کتاب کے علمی و تحقیقی وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس مقالے میں مصنف نے ترکی، مصر، ایران، افغانستان، بنگلہ دیش اور پاکستان میں شبلی شناسی میں ہونے والی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ شبلی کے سفرِ روم (استنبول) کے پس منظر میں ترکی میں شبلی کے تعلقات اور بالخصوص محمد عمر رضا کحالہ آفندی کی طرف سے الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کے ترکی زبان میں تراجم کا ذکر کیا ہے۔ اسی سفر میں شبلی مصر میں قیام رہا، مضمون نگار نے مصری علماء سے شبلی کے تعلقات، شبلی کی طرف سے مسلم تمدن اور تاریخ پر جرجی زیدان کے اعتراضات کا جواب اور پروفیسر عبدالوہاب عزام اور مولانا محمد اسماعیل ندوی مدراسی کی طرف سے سیرۃ النبیؐ کے عربی ترجمے کی کوششوں کو بیان کیا ہے۔ افسوس کہ یہ ترجمہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ مضمون نگار نے مذکورہ معلومات کے علاوہ مصر میں شبلی پر ہونے والے کام سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر کے تحقیقی دیانت کا ثبوت دیا ہے، لکھتے ہیں کہ 'مصر اور مصری اربابِ نظر نے شبلی پر کیا کام کیا؟ اور ان کے علمی کمالات کا کس درجہ اعتراف کیا، اس کی کوئی تفصیل راقم کو دستیاب نہ ہو سکی'۔ (۱۶۹) شعر العجم کی اشاعت کے بعد ایران میں شبلی کی مقبولیت، تاریخ ادبِ ایران کے مصنف پروفیسر براؤن کی طرف سے شبلی کی عظمت کا اعتراف اور شبلی کے مترجمین اور مداحین سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، سعید نفیسی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، احمد گلچیں معانی، توفیق سبحانی اور علی اصغر حکمت کی خدمات کا مفصل تعارف پیش کیا ہے۔ ایران میں شبلی سے متعلق کام پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ ایرانی اہلِ قلم نے شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا۔ شبلی جس قدر ایران میں مقبول ہوئے اور جس قدر اہلِ فارس نے ان کی قدر دانی کی، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔" (ص ۱۷۴)

افغانستان میں منصور انصاری، سرور خان گویا اور برہان الدین نے شعر العجم کی مختلف جلدوں اور ہمشیرہ نادر خاں، والدہ اسد اللہ خاں، نجف علی عاصی جلال پوری کی طرف سے الفاروق کے فارسی

تراجم اور تصحیح کے علاوہ برہان الدین عزیز الدین سیفی اور محمد اسرائیل کی طرف سے سیرۃ النبیؐ اور غلام قادر کے پشتو تراجم پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عربی زبان میں شبلی شناسی کے حوالے سے ۱۹۸۹ء میں اعلام میں مطبوعہ خیر الدین زرکلی کے ایک مضمون اور ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم کے قلم سے الفاروق کے عربی ترجمے کے علاوہ عرب دنیا میں بالعموم خاموشی رہی ہے، جس پر مصنف نے بجا طور پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پاکستان میں شبلی شناسی پر بات کرتے ہوئے مصنف نے شیخ محمد اکرام، وحید قریشی، سید عبداللہ، سید یحییٰ احمد ہاشمی، سید محمد آزاد، افتخار حسین، معین الدین انصاری، محمد اسحاق شمس، مفتون احمد، نصیر الدین کی کتب کے علاوہ البصیر کریسنٹ کے شبلی نمبروں کا ذکر کیا ہے۔ اس مختصر تعارف کے بعد انہوں نے اعتراف کیا کہ پاکستان میں شبلی شناسی کا یہ ایک اجمالی ذکر ہے، اس کا مطالعہ وجائزہ ایک علیحدہ مقالے کا متقاضی ہے۔ (ص:۱۷۹۔۱۸۰) دستیاب معلومات کی بنیاد پر بنگلہ دیش میں شبلی شناسی کا دائرہ الغزالی کے بنگالی ترجمے، خاور کے شبلی نمبر اور آفتاب احمد صدیقی کی کتاب شبلی ایک دبستان تک محدود ہے۔ ایک طرف تو یہ مقالہ ڈاکٹر اعظمی کی تحقیقی ذوق پر دال ہے تو دوسری جانب وہ انہیں اس موضوع پر اپنی تحقیقات کا دائرہ وسیع کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے، تاہم ان کا کہنا بجا ہے کہ اس کے مطالعے سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں شبلی کے فکر وخیال اور ان کی تصانیف نے بڑی مقبولیت پائی، لیکن ان کا یہ بیان نظر ثانی کا متقاضی ہے کہ شبلی کے ہم عصروں میں کوئی اس مقبولیت میں ان کا ہم پلہ نہیں۔ (ص ۱۸۰)

عہد حاضر میں علامہ شبلی کی تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت نہایت سلیقے سے لکھا گیا مضمون ہے۔ مصنف نے درست نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے قوم کے سامنے متعدد تجاویز پیش کیں اور علمی وعملی جدوجہد کے منصوبے بنائے، جو نہ صرف ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، بلکہ ہماری تاریخ کا روشن ترین باب بھی۔ (ص ۱۸۲) اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے شبلی اسکول اعظم گڑھ کے مقاصد کے پیش نظر اسکول کی بعد کی علمی وتعلیمی حالت کا جائزہ لیا ہے اور اس حوالے سے اطمینان کا اظہار کیا کہ اس اسکول نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور بڑے باصلاحیت افراد پیدا کیے، جنہوں نے ہندوستان اور بیرون ملک اس کی نیک نامی میں نہ صرف اضافہ کیا، بلکہ بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اعلیٰ مذہبی تربیت گاہ بنانے کی طرف سرے سے توجہ نہیں دی گئی اور نہ اسلامی بورڈنگ آج تک قائم کیا گیا ہے۔ (ص ۱۸۳) مضمون نگار نے فرمانروایان اسلام کے حالات اور کارنامے قلم بند کرنے سے متعلق شبلی کے منصوبے اور کام کی وسعت کے پیش نظر محض دو تالیفات (المامون اور الفاروق) کی تکمیل کے ذکر کے بعد دل سوزی سے لکھا کہ پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی، حتیٰ کہ ان کے تلامذہ اور منتسبین نے بھی درخور اعتنا نہ کیا (سمجھا)۔ (ص ۱۸۴) مصنف نے ناموران اسلام سے متعلق شبلی کے منصوبے اور سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم کے علاوہ ابن رشد اور ابن تیمیہ سے متعلق مقالات کا حوالہ دیا ہے اور اس منصوبے کی تکمیل میں ان کے تلازمہ کے کارناموں کو سراہا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے عبدالسلام ندوی کی تالیفات امام رازی، ابن خلدون، سیرت عمر بن عبدالعزیز، سید سلیمان ندوی کی سیرت عائشہؓ، حیات مالکؒ، خیام، محمد یونس انصاری کی ابن رشد اور محمد یوسف کوکن عمری کی تالیف ابن تیمیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اعظمی نے قدیم اور نادر اسلامی کتب کی اشاعت سے متعلق شبلی کی تجویز کا ذکر کیا ہے، تاہم اس حوالے سے کام کی رفتار سید سلیمان ندوی کے تبصرے کو پیش کیا ہے، جس کے مطابق جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انہوں (شبلی) نے لیا تھا، ان میں سے ایک کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی میں چھپ گئیں۔ (ص ۱۸۷) مدارس کے نصاب میں تبدیلی کے لیے شبلی کی تجاویز پر بات کرتے ہوئے مضمون نے اعتراف کیا ہے کہ انہیں پوری طور پر کامیابی نہیں ملی، (ص ۱۸۸) تاہم ندوہ کے نصاب میں تبدیلی کے لیے کی جانے والی جدوجہد کو شبلی کا ایک کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ مصنف نے شبلی کی طرف سے مدارس میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں کی تدریس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ اگر سو سال پہلے کی پیش کردہ ان تجویزوں پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دور اندیش شبلی کے خیالات صدفیصد درست تھے۔ (ص ۱۸۹) ڈاکٹر اعظمی نے مسلمانوں کی طرف سے انگریزی

ترجمۂ قرآن کے لیے شبلی کی تڑپ کا ذکر کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا کہ اس سلسلہ میں علامہ کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں اور اب کئی معتبر انگریزی ترجمے دستیاب ہیں۔ (۱۹۰) شبلی شعر العجم سے پہلے شعر العرب لکھنا چاہتے تھے، لیکن ابنِ رشیق کی کتاب العمدہ پر مفصل تبصرے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ مصنف نے مطلع کیا ہے کہ شبلی کے شاگرد عبدالسلام ندوی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا، مگر وہ بھی اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ (ص ۱۹۰) شبلی نے علمِ کلام کے حوالے سے اپنے منصوبے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا، لیکن بقول ڈاکٹر اعظمی، یہ سلسلہ بھی نامکمل رہا، خاص طور پر جدید علم کا دوسرا حصہ، جس کا نام انہوں نے علوم القرآن قرار دیا۔ (ص ۱۹۱) مضمون نگار نے اس سلسلے میں فتویٔ تکفیر کو رکاوٹ قرار دیا اور لکھا کہ علامہ شبلی خود اپنے مقاصد میں کسی قدر ناکام رہے، پھر ان کے بعد کون توجہ دیتا۔ (ص ۱۹۲) شبلی کے آخری برسوں میں آریاؤں کی طرف سے فتنہ ارتداد برپا ہوا تو انہوں نے خود بھی علمی اور عملی جدوجہد شروع کی اور دیہاتوں میں واعظین اور مکاتب میں مسلمان مدرسین کے تقرر اور دینیات کے نصاب کی ترتیب جیسی تجاویز پر مشتمل حفاظت واشاعتِ اسلام کا منصوبہ پیش کیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ملک کی موجودہ صورتِ حال میں علامہ شبلی کے منصوبہ اشاعتِ اسلام کی افادیت کم نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی طریقہ کار اپنا کر ایک بار پھر مخالفینِ اسلام کے عزائم کے تاروپود کو بکھیرا جاسکتا ہے۔ (ص ۱۹۴) شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد کو مستشرقین کے اعتراضات اور الزامات کے رد وابطال کے لیے مختص کرنا چاہتے تھے، جس پر بعد میں عمل درآمد نہ ہوسکا اور اب یہ کام مزید مشکل ہوگیا ہے، کیونکہ بقول ڈاکٹر اعظمی، آج تو شاید ہی کوئی اہلِ قلم ہو، جو یورپ کے موجودہ علمی وتحقیقی کارناموں سے پورے طور پر واقفیت رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہمارے علمی کاموں پر یورپ کے اعتراضات کیا کیا ہیں۔ (۱۹۵) مضمون نگار نے شبلی کی طرف سے وقف علی الاولاد کی تحریک اور محمد علی جناح کے تعاون سے اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور اسی طرح شبلی کی طرح سے نمازِ جمعہ کے لیے تعطیل کی تحریک اور اس میں سرخرو ہونے کا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس سے سبق لیں تو یقیناً آزاد ہندوستان میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے، خاص طور سے تعطیلِ جمعہ کے لیے برپا کی جاسکتی ہے۔ (ص ۱۹۶) شبلی کی نشاندہی پر سرسید نے علی گڑھ میں صیغہ اغلاطِ تاریخی میں تصحیح قائم کیا، علی گڑھ کے بعد شبلی نے ندوۃ العلماء میں بھی اس کی بنیاد رکھی، لیکن ندوہ سے شبلی کی علیحدگی کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مصنف نے شبلی کے اس منصوبے کو معارف کے پرچوں میں شائع ہونے والے بعض مقالات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی کی زندگی کا آخری بڑا منصوبہ دارالمصنفین کا قیام تھا، جس کے مقاصد کے پیش نظر مضمون نگار نے اس کے اشاعتی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ اس ادارہ نے جو علمی ذخیرہ قوم کے سامنے پیش کیا، اس کی مثال شاید ہی مل سکے، تاہم وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ سیرۃ النبیؐ پر مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا، تاریخِ اسلام کی چار جلدوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا، تاریخ اندلس حصہ اول کے بعد بقیہ حصے شائع نہ ہوسکے، تاریخ ہند پر کوئی مبسوط اور مدلل کتاب بھی نہ لکھی جاسکی، شبلی کے سلسلۂ ناموران اسلام کا ایک حصہ بھی سپردِ قلم نہ ہوسکا، ناموران اسلام اور حکمائے اسلام پر جس قدر کام ہونا چاہیے تھا، وہ بھی نہ ہوسکا۔ (۱۹۷۔۱۹۸) مضمون کے آخر میں مصنف نے شبلی کی طرف سے معارف کے منصوبے کا ذکر کیا ہے، جو ان کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا اور ایک صدی سے باقاعدگی سے جاری ہے۔ معارف کی علمی اہمیت کو مصنف نے علامہ اقبال کے اس بیان سے ثابت کیا ہے کہ معارف ایک ایسا رسالہ ہے، جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ (ص ۱۹۸) مصنف نے بجا طور پر کہا ہے کہ شبلی کے ان منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہم اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ (ص ۱۹۸)

دیگر مضامین میں سے علامہ شبلی، ایک عاشقِ رسولؐ میں ڈاکٹر اعظمی نے مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا ارشاد حسین رامپوری اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے فیضان، نوجوانی میں روضہ رسولؐ پر لکھی گئی مثنوی، علی گڑھ میں میلاد مجلسوں کے اہتمام، علی گڑھ کے نصابی ضرورت کے پیش نظر سیرتِ نبوی پر عربی میں تاریخ بدء الاسلام کی تالیف، سیرۃ النبی کی تدوین اور کلام شبلی سے بعض نعتیہ نظموں سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے کسی

ندرت کا اندازہ نہیں ہوتا، بلکہ سابقہ معلومات کی ترتیب میں بھی بہتری کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ 'اردو زبان وادب کے ارتقا میں علامہ شبلی کا حصہ' میں مصنف نے علامہ کی مقالہ نگاری، سوانح نگاری، تاریخ نگاری، تنقید نگاری، کلامی ادب، فارسی ادب، موازنۂ انیس ودبیر، سیاسی ادب، مکتوباتی ادب، سیرت نگاری، اسلوب نگارش، شاعری، بحیثیت مدیر، انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین جیسے عنوانات کے تحت گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون تحقیقی یا تنقیدی نہیں، بلکہ تعارفی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے شبلی کا ابتدائی قاری بنیادی معلومات حاصل کرسکتا ہے۔ 'علامہ شبلی بحیثیت مدیر' میں مصنف نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، الندوہ اور معارف کے حوالے سے علامہ شبلی کی مدیرانہ صلاحیتوں، پرچوں کے مقاصد، مضامین کے انتخاب، ان پرچوں کے ذریعے نوجوانوں کی تصنیفی تربیت، شاگرد مدیروں کی علمی نگرانی، مطبوعہ مضامین کے اثرات اور پرچوں کی تاریخی اہمیت پر تفصیل سے لکھا ہے۔ مضمون کے اولین پیراگراف میں ہی نتیجہ فکر پیش کردیا کہ 'علامہ شبلی نے مدیر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیے، اس کا مطالعہ آج بھی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں۔ (ص ۸۰)' 'علامہ شبلی علی گڑھ' بھی ایک تعارفی نوعیت کا مضمون ہے، جس میں مصنف نے علی گڑھ سے شبلی کی وابستگی، سرسید سے ابتدائی تعلقات، کالج میں عربی وفارسی کا ذوق، کالج میں درسِ قرآن، شعروشاعری، تصنیف وتالیف جیسے عنوانات کے تحت بنیادی معلومات دینے کے بعد علی گڑھ میں قیام کے دوران میں منصۂ شہود پر آنے والی شبلی کی تصانیف پر مختصر نوٹ تحریر کیے ہیں۔

شبلی کی تصانیف کے ضمن پر ڈاکٹر اعظمی نے 'تذکرہ گلشنِ ہند اور علامہ شبلی'، 'کچھ موازنۂ انیس ودبیر کے بارے میں'، 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر (بعض اعتراضات کا جائزہ)'، 'علامہ شبلی کے تاریخی مقالات' اور 'شبلی کی اردو شاعری' پر مضمون شامل ہیں، جن میں سے پہلے دو قابلِ ذکر ہیں۔

'تذکرہ گلشنِ ہند اور علامہ شبلی' مصنف کے تحقیقی ذوق کا ترجمان ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے تذکرے کی پہلی اشاعت کے وقت مولوی عبدالحق کی طرف سے مقدمہ میں اور دوسری اشاعت (۱۹۳۲ء) میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی طرف سے شبلی کے نام سے احتراز اور حیاتِ شبلی میں سید سلیمان ندوی کی طرف سے اس تدوین کے سلسلے میں خاموشی پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ مضمون نگار نے علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے گلزارِ ابراہیم اور مرزا علی خاں لطف کے اس اردو ترجمے (تذکرہ گلشنِ ہند ۱۸۰۱ء) کا موازنہ کرکے حذف وترمیم واضافہ کی مختصر تفصیل دی ہے، تذکرے کے حصول سے اس کی اشاعت تک کا سفر بیان کیا ہے اور تصحیح وتدوین میں علامہ شبلی نے جن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، ان کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ تحقیقی ومراجعت، وضاحتی وتشریحی نوٹ، اضافات، صحتِ املا اور ناموزوں اشعار، علمی ادبی، اور معلوماتی حواشی کے عنوانات باندھ کر نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مضمون کے آخر میں مصنف نے تذکرے کی اولین اشاعت میں مولوی عبدالحق کے مقدمے سے شبلی کی تنقیص ومذمت میں ان کے بعض بیانات نقل کرکے ان پر بحث کی ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ 'مقدمہ میں انہوں نے علامہ شبلی کے تصحیح وتحشیہ اور اس کی طباعت کی کوششوں کا اعتراف تو درکنار، ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا'۔ (ص ۵۰)

'کچھ موازنۂ انیس ودبیر کے بارے میں' ڈاکٹر فیضان کے اس مضمون کے جواب میں لکھا گیا، جو اعظم گڑھ کے ماہنامہ الرشاد (فروری ۲۰۰۸ء) میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فیضان نے نیشنل میوزیم میں محفوظ مخطوطۂ موازنہ کا ۱۹۰۷ء میں مطبوعہ موازنہ سے تقابل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'مطبوعہ اور مخطوطہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے'۔ (ص ۲۰) ڈاکٹر اعظمی کا کہنا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی، ردموازنہ، تردید الموازنہ اور المیز ان کے مصنفین، حیات شبلی اور موازنہ کی طبع جدید کے ناشر مولانا ضیاء الدین اصلاحی (ناظم دارالمصنفین) میں سے کسی نے موازنۂ انیس ودبیر کے متن اور اشاعت میں ردوبدل کی نشاندہی نہیں کی۔ مصنف نے ڈاکٹر فیضان کے بیان کردہ مخطوطے کو اکتوبر ۱۹۰۳ء کا مسودہ قرار دیا ہے، جو نامکمل رہا اور حتمی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اصل موازنۂ انیس ودبیر وہی ہے، جسے علامہ شبلی

نے ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع کیا تھا'۔(ص ۶۰) اس مضمون کی ایک خاص بات مصنف کی طرف سے بامر مجبوری اپنے بارے میں بعض توصیفی کلمات کی شمولیت ہے۔

دیگر مضامین میں' اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر (بعض اعتراضات کا جائزہ)' میں علامہ شبلی کی اس تصنیف پر مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض حواشی کو بنیاد بنا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق صدر شعبہ تاریخ وثقافت، سید عزیزالدین حسین ہمدانی نے شبلی کے نقطہ نظر پر اعتراضات کیے، ان کا یہ مضمون ماہنامہ جامعہ دہلی کے شمارہ جون ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اعظمی نے دلائل کے ساتھ ہمدانی صاحب کے تمام اعتراضات کے جواب فراہم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض مقامات پر موضوع کے مطالبات کے تحت طویل اقتباسات بھی دینے پڑے۔ اگرچہ اپنے موضوع پر یہ مضمون حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا، تاہم مصنف کی دردمندی قابلِ ستائش ہے۔'علامہ شبلی کے تاریخی مقالات' میں مصنف نے رسائلِ شبلی اور بعد میں مقالاتِ شبلی کی پانچویں اور چھٹی جلد میں شامل شبلی کے اکیس مقالات پر مختصر تعارفی نوٹ تحریر کیے ہیں اور آخر میں ان مقالات کے تحت شبلی کی دس خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان خصوصیات کا کشید کرنے میں مصنف نے خاصی محنت کی ہے، تاہم ان کا یہ بیان نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ وہ ابنِ خلدون کے بعد پہلے مسلمان مؤرخ ہیں، جنہوں نے ایک نظریۂ تاریخ پیش کیا اور نہ صرف نظریۂ تاریخ پیش کیا، بلکہ اپنی تصانیف میں خود ان پر عمل پیرا بھی رہے۔(۹۲)'شبلی کی اردو شاعری' بھی تعارفی قسم کا مضمون ہے، جس میں شبلی کے شاعرانہ صلاحیتوں کے ارتقا اور ان کے شعری مجموعوں سے متعلق مختصر گفتگو کے بعد مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مسدس، غزل، قطعات، جدید مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں اور سیاسی نظمیں کے عنوانات باندھ کر چند مثالیں دی گئی ہیں۔ مندرجات کے اعتبار سے یہ مضمون اپنے موضوع پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

شبلی پر تصانیف کے حوالے سے ڈاکٹر اعظمی نے تین مضامین پیش کیے ہیں،............ (بقیہ:ص:۱۳۰ر پر)

عبداللہ کمال اکمل۔ مقیم حال قطر

غزل

اگر زمین نہیں، آسمان بن جاؤ
کسی کا گھر نہ سہی، سائبان بن جاؤ

فریب کر کے بڑی سادگی سے اس نے کہا
پھر ایک بار چلو خوش گمان بن جاؤ

ہر ایک بات پہ سختی بھی نامناسب ہے
کبھی تیر، کبھی تم کمان بن جاؤ

مٹا نہ پائے زمانہ تیرا نشان کبھی
کچھ ایسا کام کرو کہ نشان بن جاؤ

سدا سے ظلم و تشدد تو ان کی عادت ہے
تمھیں پتہ ہے تمھیں سخت جان بن جاؤ

لڑائی جاری رکھو ظلم کے خلاف اکمل
جو بے زبان ہیں ان کی زبان بن جاؤ

ڈاکٹر رفیعہ شمیم۔ حیدر آباد

اردو افسانہ اور محشر عابدی

''وعدۂ شکن'' میں ''تدبیر'' کو موضوع بنایا گیا ہے اس کا کردار زندگی میں ہونے والے حادثات کا صبر اور استقلال سے مقابلہ کرتا ہے اور اپنی حکمت عملی سے نامکمل ادھوری زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرتا ہے اسکا پلاٹ سیدھا سادھا ہے زبان و بیان بھی رواں دواں ہے اس لئے کہانی ایک تسلسل کی ساتھ آگے بڑھتی ہے ایک اقتباس پیش ہے۔

''چودانگ خاموش ہوگیا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ اٹھا۔ اسکے دماغ میں کوئی مفید تدبیر آ گئی تھی۔ اس نے تمام آرائش اور ساز و سامان کو ضائع کر دینا نہ چاہا۔ اس نے آپ ہی جا کر پنکھے والی بیوہ عورت کو تلاش کیا اسے اپنے گھر لے آیا اور قاضی کو بلا کر اس سے اپنا عقد کرلیا۔

دونوں ایک دوسرے کی فطرت اور اخلاقی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے اس لیے وہ شادی کے بعد ایکدوسرے کی غلطی معاف کرنے اور عیوب سے چشم پوشی کرنے کے رموز سے آشنا ہو گئے تھے۔ ۱۲

اس افسانے میں ڈاکٹر محشر عابدی نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان کو نہ صرف اچھائیوں بلکہ کمزوریوں کیساتھ اپنانا چاہئے۔

افسانہ ''دلہن'' کا موضوع ''رسم و رواج کی پابندیاں'' ہیں اس میں نسوانی کردار کے ذہنی کشمکش کو پیش (اجاگر) کیا گیا ہے جو قدیم و جدید تہذیب کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے للّی جسکے نام سے عیسائیت کا اظہار ہوتا ہے انگریزی طرز تعلیم اور جدید تہذیب و تمدن کی پروردہ تھی لیکن جب اس کی شادی گاؤں کے قدامت پرست خاندان میں ہوتی ہے تو اس کو سسرالی رسم و رواج کو اپنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے حالانکہ اس کا شوہر اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر ہر طرح اس کی مدد کرتا ہے للّی کے سسرال میں عورتوں کا ساڑی پہننا، صابن استعمال کرنا، انگریزی کتابیں پڑھنا، جوتا پہننا، سسرالی رشتہ دار آدمیوں کے سامنے نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے للّی اس کے شوہر اندو بھوشن کی خواہش کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے کلکتہ جاتی ہے تو وہ پہلے کی طرح بیوقوف اسکول کی طالبہ نہ تھی جو دیہاتی طرز معاشرت اور سماجی حالات سے واقف نہ ہو اس نے بہت کچھ معلومات حاصل کر لئے تھے جب مدرسے کے سالانہ جلسہ میں ''برٹینیا'' سمندر کی ملکہ'' رول کیلئے شو کرنے اسٹیج پر پہنچی ہے تو سامعین پر نگاہ پڑتے ہی بیہوش ہو جاتی ہے ایک اقتباس پیش ہے۔

''آخر کار اپنے حادثہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حاضرین میں للّی نے سب سے پہلے جس شخص کو دیکھا ہے وہ اندو بھوشن کا ماموں رائے چرن وظیفہ یاب اسکول انسپکٹر تھا اور اس کی نظر للّی پر پڑنا للّی کیلئے ایک گناہ عظیم تھا اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا خاندانی رسم کے مطابق وہ بھی للّی کو نہ دیکھ سکتا تھا۔

یہ دونوں معزز مہمان تھے جو صبح کے وقت للّی کے مکان پر آئے تھے اس کے بعد للّی کے مدرسہ چلے گئے تھے اس روز سے للّی پھر مدرسہ نہیں گئی۔ ۱۳

اس افسانے کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو سسرال کی طرز معاشرت اور رسم و رواج کو اپنانا

چاہیئے اور اسکو ہر ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے اس لئے اس میں لچک ہونا ضروری ہے۔

''وعدہ شکن'' میں ''وعدہ خلافی'' کو موضوع بنایا گیا ہے ایک ایسی عورت کی کہانی جو وعدہ وفا نہ کرسکی یہ افسانہ ہانسی کی وفا شعاری سے شروع ہوکر خودکشی پر ختم ہوتا ہے اس کا پلاٹ مربوط ہے اور کہانی ایک بہاؤ میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے کہانی میں ربط و تسلسل کی کارفرمائی ہے اسلئے قاری بھی کہانی کے بہاؤ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ایک اقتباس پیش ہے۔

''ہانسی نفس پرست ہانسی وعدہ شکن ہانسی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے لرز گئی اس کے لئے دنیا میں اس سے بڑھکر اور کوئی ذلت نہ ہوسکتی تھی کہ اس نے اپنے عزیز شوہر سے وعدہ شکنی کی تھی۔

چوڈانگ اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا اور آخر کار پھر اس کمرے میں جا پہنچا جہاں اس کا تابوت رکھا تھا اس نے دیکھا اور دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے دیکھا اور دل تھام کر رہ گیا ہانسی نے ذلت، ندامت اور بیوفائی کا صدمہ نہ برداشت کر کے خودکشی کر لی تھی۔ [۱۴]

اس افسانے کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر محشر عابدی نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان کو نفس کا غلام نہیں بننا چاہیئے۔

''فرشتے کی سیر'' کا پلاٹ متوازن اور گھٹا ہوا ہے ڈاکٹر محشر عابدی نے جابجا منظر نگاری سے کام لیا ہے۔ کہانی آغاز سے انجام تک اپنے طور پر آگے بڑھتی ہے اس کہانی میں منظر نگاری دلکش اور دل کو چھو لینے والی ہے اس کی عکاسی اس افسانے میں یوں ملتی ہے۔

''دنیا مجسم دھندلکا بنی ہوئی تھی دنیا کی ساری فضا کہر ہی کہر تھی سردی زوروں پر تھی اور برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمان سے زمین کی طرف پرواز کر رہے تھے سردی کے مارے لوگ ٹھٹھرے جا رہے تھے اور کپڑوں میں لپٹے پڑے تھے ساری دنیا ایک موت کی سی خاموشی میں مدہوش اور متفرق تھی۔ ''محبت کا فرشتہ'' قصر فردوس سے نکلا اور اس وقت جب کہ ساری دنیا کی فضا دھندلی تھی زمین اور زمین کی مخلوقات نے اسے زمین کی طرف پرواز کرتے دیکھا وہ آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہا تھا اور آخر کار فرشتوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

دھندلکا بدستور چھا رہا تھا سردی زور پر تھی اور برف گر رہی تھی فرشتۂ محبت انسانی بہروپ میں زمین پر نمودار ہوا اور نہایت معمولی اور سادہ لباس پہن کر دنیا کی سیر میں منہمک ہوگیا''۔ [۱۵]

اس افسانے کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ محشر عابدی مناظر فطرت کی بہترین عکاسی پر قدرت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر محشر عابدی ''نغمہ پرست'' میں بے مثال قربانی کو موضوع بنایا ہے۔ جب یہ دل مچلتا ہے اور کسی کی چاہت اور محبت کو اپنے اندر جگہ دیتا ہے تو ایک زمانے کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے دلِ عاشق کی گہرائی اور گیرائی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عشق کی پاکیزگی اور عزت نفس کی باریکیوں کا ادراک کر سکتے ہیں اس میں کردار کی پاکیزگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ درج ذیل اقتباس میں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔

''خوشبو دار پھولوں سے کمرہ معطر ہوگیا مسہری پر کمخواب اور زربفت کا زرین بچھونا بچھا تھا اور اس پر حسین روپ متی لیٹی ہوئی تھی اس کے چہرے پر ریشم کا ایک باریک نقاب پڑا تھا اور اس کے حسن کی تجلیاں نقاب سے چھن چھن کر سارے کمرے کو بقعۂ نور بنائے ہوئے تھیں اور اس پر رنگین فانوس اور شمع کی روشنیاں جھلملا جھلملا کر اپنی گلابی اور سنہری کرنوں سے نور برسا رہی تھیں۔

آدم خاں مسہری کے قریب پہنچ گیا اور پُرارمان نگاہوں سے روپ متی کو دیکھنے لگا وہ خوش

ہوگیا۔روپ متی کے پھول سے چہرہ پر تبسم کی چمک تھی اوراس کے نازک لب گلگوں، مسکراہٹ کے انداز سے بند تھے لیکن وہ کس قدر خاموش تھی۔؟ خاموش اور خود فراموشی چپ اورانتہائی سکوت میں گم صُم۔

اس نے سردآہ بھر کر کہا ''پیاری خاتون'' اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا جو چادر کے اوپر رکھا ہوا تھا لیکن وہ سرد تھا، سرد اور بالکل سرد، وہ بیقرار ہوکر چلا اٹھا اور اپنا ہاتھ اس کے سینہ پر رکھا لیکن اس میں کوئی حرکت نہ تھی گھبرلیا اور وحشت زدہ کمرہ سے باہر آیا اور روپ متی سوتی رہی وفا شعاری کی نیند میں کھوئی ہوئی، محبت کے خواب میں گم۔ گہری اور ابدی نیند۔زہر پہلے ہی کامل طور پر اپنا کام کر چکا تھا، بعد میں اس کے تکیہ کے نیچے سے ایک کاغذ ملا۔ ۱۸

اس افسانے کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایثاروقربانی جذبات کا احترام اور رشتوں کی پاسداری کو اس کہانی کا نکتہ بنا کر پیش کیا ہے۔

افسانہ ''انتظار'' میں محشر عابدی نے ایک طرف معاشی پسماندگی کو اور دوسری طرف ''صبر و استقلال'' استقامت کو موضوع بنایا ہے۔صابرہ ناامیدی میں آس اور امید کے چراغ جلائے محوانتظار شاید اس کی زندگی میں خوشیاں لوٹ آئے۔ ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد جب خوشیاں اس کے دروازے پر دستک دیتی ہیں تو قسمت اس پر مہربان ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے اور وہ غم کے اتھاہ سمندر میں غرق (گم) ہو جاتی ہے۔ایک اقتباس بطور مثال پیش ہے۔

''یکا یک مکان کا دروازہ کھلا مگر اسے معلوم نہ ہوا سامنے سے کسی آنے والے کو دیکھ کر وہ چونک پڑی، آندھی کی طرح اٹھی اور تیر کی طرح اس کے سامنے جا پہنچی یہ وہی مزدور تھا جو شاہد کا سامان لایا تھا۔صابرہ نے متوحش انداز سے مزدور کو دیکھا اور گھبرا کر پوچھا شاہد میاں کہاں ہیں؟ مزدور نے دردناک لہجہ میں جواب دیا۔آہ وہ تو ندی میں ڈوب کر مر گئے۔پولیس نے نعش نکالی ہے۔

اس جواب نے صابرہ کو تڑپا دیا اس نے ایک مرتبہ آہ شاہد کہا اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی، بہت دیر کے بعد اسے ہوش آیا وہ برق کی طرح اٹھی آہ شاہد۔آہ شاہد مجھے کیوں چھوڑ گئے کا نعرہ جگر خراش لگاتی ہوئی گھر سے نکلی۔ بجلی اس طرح چمک رہی تھی۔ بادل ویسے ہی گرج رہے تھے۔بوندیں پڑنے لگی تھیں وہ بے تحاشہ دوڑنے لگی دوڑتی گئی اور آخر کار گھنے درختوں میں پہنچ کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئی۔۱۹

ڈاکٹر محشر عابدی نے اس افسانے میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان لاکھ تدبیریں کرے وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیرانتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔موبائل: 9392533661

ابو ہریرہ یوسفی

حیدرآباد کی اردو صحافت اور روزنامے

حیدرآباد دکن اردو زبان وادب اور صحافت کے لحاظ سے اپنی ایک قدیم تاریخی شناخت رکھتا ہے۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کا ماضی شاندار رہا ہے، اس لیے آزادی سے قبل انگریزوں کے زیر قبضہ ہندستان میں حیدرآباد دکن ایک آزاد اور خودمختار ریاست تھی، جہاں اردو اور فارسی سناشوں کی حکومت تھی اور یہاں کی مسلم عوام میں بھی اردو زبان بولی، پڑھی اور لکھی جارہی تھی۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اردو صحافت کی ۱۶۵ر سالہ تاریخ رہی ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۸۵۵ء میں طبابت کے نام سے اردو کا سب سے پہلا رسالہ جاری ہوا، جس میں یونانی اور مغربی طب کے مضامین چھپتے تھے، یہ رسالہ سرمئی فل اسکیپ کی تختی پر ۲۷ر صفحات میں نکلتا تھا۔ چند سالوں بعد حیدرآباد میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ۱۸۶۰ء میں ”آفتاب دکن“ کا اجراعمل میں آیا، اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں ”خورشید دکن“ کی اشاعت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا روزنامہ ”ہزارداستان“ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا، اس کے بعد سے ہی اردو روزناموں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں ”آصفی“ ۱۹۰۲ء میں ”علم وعمل“ اور ”معارف“ ۱۹۲۰ء میں ”رہبر دکن“ اور ۱۹۲۸ء میں ”صبح دکن“ جیسے اخبارات نکلتے رہے۔ اقبال عابدی اپنے مضمون ”تاریخ اردو صحافت“ میں حیدرآباد کے قدیم اخبارات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اسی زمانے میں قاضی عبد الغفار نے ”پیام“۔ نرسنگ راؤ نے ”رعیت“ اور محمد محی الدین نے ”رہبر دکن“ شروع کیے، جبکہ ۱۹۳۶ء میں مجلّہ ”عثمانیہ“ کا اجرا ہوا، جس کے ایڈیٹر معین الدین قریشی اور ڈاکٹر زور تھے۔ مجلّہ ”عثمانیہ“ کی اشاعت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے لکھنے والوں میں کئی نوجوان طلبا شامل تھے، جنہوں نے مستقبل میں اردو صحافت کی ترقی میں قابل لحاظ حصہ لیا۔ روزنامہ ”رہبر دکن“ آزادی سے قبل کے اخبارات میں سب سے مقبول اور معیاری اخبار تھا، اس کا نام تبدیل کرکے ”رہنمائے دکن“ کردیا گیا، یہ آج بھی شائع ہورہا ہے، جبکہ روزنامہ ”امروز“ شعیب اللہ خان کی ادارت میں نکلا، لیکن ان کے قتل کے بعد بند ہوگیا“۔
(تاریخ اردو صحافت۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد، ۸ر اگست ۲۰۰۴ء)

اس کے علاوہ ”نظام گزٹ“ ۱۹۲۷ء سے جاری ہوا اور تقریباً چالیس سال تک صحافت کے افق پر روشنی بکھیرتا رہا، حالانکہ اس وقت کا دور نشیب وفراز سے گزر رہا تھا، اس کے باوجود بھی اس اخبار کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں ہوا، یہاں تک کہ حیدرآباد کے آخری حکمراں نظام آصف سابع کی حکومت کا ترجمان بن کر شائع ہوتا رہا اور اس آخری زمانے میں یہی ایک اخبار بھی تھا، جس میں نظام حیدرآباد کے مضامین چھپتے تھے۔

مذکورہ جملہ اخبارات قبل از آزادی کے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں اردو صحافت کا ماضی بہت روشن رہا ہے، تاہم سبھی اخبارات علاوہ ”رہنمائے دکن“ (نام کی

تبدیلی کے ساتھ ابھی بھی جاری ہے) بند ہو چکے ہیں اور ان اخبارات کے بند ہونے کی الگ الگ وجوہات ہیں، جن کا تذکرہ اس مقالے کی طوالت کا باعث بنے گا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد میں آزادی سے پہلے کی اردو صحافت کا ایک سنہرا دور تھا، تاہم آزادی کے بعد بھی اردو صحافت ترقی و عروج پر ہے۔ حال میں شائع ہونے والے اکثر اخبارات ترقی کی طرف گامزن ہیں اور مقبول عام بھی۔ جاری اخبارات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مرضیہ عارف لکھتی ہیں:

''آزادی کے بعد حیدرآباد میں اردو صحافت اور اس کے اخبارات کا جو دور شروع ہوا، وہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس دور میں کئی معیاری روزنامے، ہفتہ روزہ اور ماہنامے جاری ہوئے، جنہیں شمالی ہندستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ مقبولیت اور استحکام حاصل ہوا، اس کی مثالیں سیاست، منصف، رہنمائے دکن اور اعتماد کی صورت میں آج بھی موجود ہیں، جبکہ بند ہونے والے اخبارات میں نظام گزٹ، صبحِ دکن، میزان، پیام، ہماراعوام اور ملاپ کے نام قابلِ ذکر ہیں''۔

(نیادور لکھنؤ، اردو صحافت نمبر، جون رجولائی ۲۰۰۱ء، ص:۱۷۳)

موجودہ دور میں حیدرآباد سے متعدد اخبارات پابندی سے شائع ہورہے ہیں، ان میں سرفہرست اور معیاری اخبار روزنامہ ''سیاست'' ہے۔ حیدرآباد کا یہ مشہور و معروف و مقبول اخبار ہے، یہ آزادی کے دو سال بعد جاری ہوا، اس کے مدیر زاہد علی خان ہیں اور بانی عابد علی خان تھے۔ روزنامہ ''سیاست'' صرف ایک کاغذی اخبار نہیں ہے، بلکہ قوم و ملت کا ایک سہارا اور خادم بھی ہے، حیدرآباد میں بے سہارا اور نادار لوگوں کی ڈوبتی نیا کا کھونہار بھی ہے، اس لیے اس اخبار کی تعلیمی، سماجی اور فلاحی خدمات مخفی نہیں ہیں۔ سیاست کو ایک کثیرالاشاعت کا درجہ حاصل ہے، یہ اخبار ایک روشنی کا مینار ہے، جو حیدرآباد اور ہندستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ممالک کو بھی منور کر رہا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مرضیہ عارف لکھتی ہیں:

''سیاست کے بانی اور ایڈیٹر عابد علی خان کا ۱۹۹۲ء میں انتقال ہوا تو ان کے بڑے بیٹے زاہد علی خان نے اخبار کی ادارت سنبھالی، تب سے ان کی نگرانی میں سیاست نکل رہا ہے، سیاست کا سنڈے ایڈیشن ابتداء سے پورے اہتمام کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا رہا، جس میں عصری مسائل، بالخصوص نشیب و فراز، اقتصادی ہلچل اور سماجی مشکلات پر مقتدر اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں، اس میں طنزومزاح کے لیے بھی ایک گوشہ مخصوص ہے اور فلم کی تازہ معلومات پر ایک صفحہ مکمل باتصویر شائع ہوتا ہے، دو سال سے روزنامہ سیاست کے ساتھ چھوٹے سائز (۲۴x۳۲) کے ۸ر صفحات پر مشتمل ایک ضمیمہ تقریباً ہفتے میں پانچ یوم نکلتا رہتا، جس میں بچے، خواتین، صحت، تعلیم اور مذہبی موضوعات پر الگ الگ گوشے ہوتے تھے، ہفتہ میں ایک دن انگریزی میں سپلی منٹ آج بھی دیا جاتا ہے''۔

نیادور لکھنؤ، اردو صحافت نمبر، جون رجولائی ۲۰۱۱ء، ص:۱۷۵)

روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کا ایک مشہور و معروف اخبار ہے، جو ہندستان کے چند اہم بڑے روزناموں میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس اخبار کو ۱۹۷۶ء میں محمود انصاری نے جاری کیا، انہوں نے ۱۸ر سال تک اس اخبار کی ادارت کی، ان کے وصال کے بعد مسعود انصاری نے اس کی اشاعت سنبھالی، چند عرصے بعد خان محمد لطیف خان کی ملکیت میں چلا گیا، جس کو لطیف خان نے نئے سرے سے شروع کیا، اس کو جدید وسائل سے آراستہ کرنے میں بھرپور کوششیں کیں، جس کی وجہ سے آج

یہ اخبار بہترین انداز میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ روزنامہ منصف کا جمعہ اور سنڈے ایڈیشن بھی نکلتا ہے۔ جمعہ ایڈیشن میں اسلامی، اصلاحی اور تعلیمی مضامین ہوتے ہیں اور فقہی مسائل پر بھی تحریریں شائع ہوتی ہیں، اصلاحِ معاشرہ کے تعلق سے بھی علماء کرام کے مضامین منصف کے صفحات کی زینت بنتے ہیں۔ سنڈے ایڈیشن سیاسی اور سماجی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا ایک ادبی ایڈیشن ''آئینۂ ادب'' بھی ہے، جو اردو ادب کے مضامین سے مکمل طور پر آراستہ ہوتا ہے، اس میں نئے اور پرانے ادباء و شعراء کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ چار صفحہ کا ایک گلدستہ بھی نکلتا ہے، جو بچوں اور خواتین کے متعلق تحریروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ غرض کہ روزنامہ منصف حیدرآباد کے اخبارات میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے اور اب تو منصف ورقی صحافت (پرنٹ میڈیا) سے آگے بڑھ کر برقی صحافت (الیکٹرانک میڈیا) کی دنیا میں قدم رکھ چکا ہے، منصف ٹی وی کے نام سے اس کا باقاعدہ ایک چائنل ہے، جو اردو زبان میں خبریں نشر کرتا ہے۔

حیدرآباد کی سرزمین کا ایک اور اخبار روزنامہ ''اعتماد'' ہے، جس کو حیدرآباد ہی کے رہنما و سابق رکن پارلیمنٹ سلطان صلاح الدین اویسی کی سرپرستی میں ان کے بیٹے برہان الدین اویسی نے جاری کیا، یہ اخبار درحقیقت سیاسی جماعت مجلس اتحاد المسلمین کا ترجمان ہے، اس اخبار میں پارٹی کے موقف اور ان کے نظریات کی بھرپور وکالت کی جاتی ہے، جماعت کے قائدین کے سیاسی دوروں، عوامی ملاقات، عوامی و انتخابی اجلاس کی مکمل خبریں ضرور دی جاتی ہیں، کبھی کبھی یہ اخبار جذباتی رخ بھی اختیار کر لیتا ہے، اس اخبار کو کئی مرتبہ تنقیدوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، بعض تنقیدوں کا بے باک جواب بھی دیا گیا۔ اعتماد حیدرآباد کا ایک مقبول اخبار سمجھا جاتا ہے، دیگر اخبارات کی طرح اس میں بھی تقریبا ہندستان کی ہر ریاست کی خبریں شائع کی جاتی ہیں، عالمی خبروں کے لیے مکمل ایک صفحہ اور عالم اسلام کی خبریں بھی الگ سے ایک صفحہ پر دی جاتی ہیں۔ اس اخبار کا منفرد معیار یہ ہے کہ ہر روز الگ الگ موضوع پر صفحات مختص رہتے ہیں۔ چنانچہ جمعرات کے دن ایک صفحہ ''پھلواری'' کے نام سے ہوتا ہے، جس میں تاریخی باتیں، بچوں کے لیے مختصر کہانیاں، نظمیں، لطائف اور بچوں کی تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ بدھ کے روز'' سائنس، صحت اور ٹکنالوجی'' کے متعلق معلومات افزا مضامین چھپتے ہیں۔ منگل کے اخبار میں'' آنچل'' کے نام سے خواتین پر مبنی تحریریں دی جاتی ہیں، جن میں عورتوں کے معاشرتی اور طبی مسائل پر مضمون شائع ہوتے ہیں، پکوان پر بھی معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ پیر کو ایک ادبی صفحہ ''اوراق ادب'' کے عنوان سے دیا جاتا ہے، جو ادبی مضامین اور غزلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اتوار کے دن ۸/اضافی صفحات رہتے ہیں، جس میں ۶/صفحات ''جائزہ'' کے نام سے رہتا ہے، ان صفحات میں سیاسی، تعلیمی، ادبی مضامین کے علاوہ ہندستان اور دیگر ممالک کے حالات حاضرہ پر بہت سارے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں، جدید ٹکنالوجی اور کھیل پر بھی کچھ تحریریں نظر آتی ہیں، اسی میں ایک صفحہ ادبِ اطفال پر ''بچپن'' کے نام سے مخصوص ہوتا ہے، جس میں تاریخی، تفریحی، اور اخلاقی کہانیوں کے علاوہ اسلامی معلومات، پسندیدہ اشعار، حکایت، انعامی مقابلہ اور نظمیں وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ''ستاروں کی محفل'' کے نام سے ایک فلمی صفحہ بھی ہے۔ سنیچر کو بھی ''جہانِ نو'' کے نام سے ایک صفحہ کی تخصیص رہتی ہے، جس میں عصری تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم پر معلوماتی مضامین کی اشاعت ہوتی ہے۔ جمعہ کے مبارک دن پر دو صفحات ''صراطِ مستقیم'' کے عنوان سے ہوتے ہیں، اس میں خالص مذہبی، یعنی اسلامی، تاریخی اور اخلاقی مضامین کو جگہ دی جاتی ہے، قرآن و حدیث کے حوالے سے مختصر الگ الگ تحریریں دی جاتی ہیں، شرعی سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہتا ہے اور نعت شریف بھی۔ مجموعی طور پر روزنامہ اعتماد صوری اور معنوی اعتبار سے

پروفیسر مظفر علی شہ میری۔ وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول (آندھرا پردیش)

غزل

(وطن مالوف کدری کی نذر)

چنبیلی کا کبھی منڈوا سُہانا یاد آتا ہے
کبھی کیکر تلے گزرا زمانہ یاد آتا ہے

فقط ایک نام تھا اس کے لبوں پر مسکراتا تھا
گلی کوچوں میں پھرتا وہ دوانہ یاد آتا ہے

میں جب اپنی خرد کا مرثیہ تحریر کرتا ہوں
جنونِ عشق میں لکھا فسانہ یاد آتا ہے

بھلادی ہم نے اپنے کاغذی تیروں کی شیطانی
پڑی تھی مار جس پر وہ نشانہ یاد آتا ہے

جو ہم ننھے سپائی بن کے گایا کرتے تھے اکثر
وہی بھولا ہوا فوجی ترانہ یاد آتا ہے

کھجوروں کا فقط اک پیڑ جن کی بھوک کا ساتھی
ہمارے گاؤں کا اک وہ گھرانہ یاد آتا ہے

بڑی سادہ غذا کھاتے، تہجد کے لیے اٹھتے
وہ ٹیپو کا مزاجِ صوفیانہ یاد آتا ہے

وضو کے پاک پانی سے جو تھوڑا ساگ اُگتا تھا
اسے کھا کر کسی کا مسکرانا یاد آتا ہے

مرا دل جب بھٹکتا ہے جہالت کے اندھیروں میں
مظفؔر کا کلام عارفانہ یاد آتا ہے

خوب سے خوب تر ہے، اعتماد اس وقت ترقیوں کی بلندی پر ہے، حیدرآباد کی اردو صحافت میں اس نے بھی اپنا ایک اہم مقام بنالیا ہے۔

روزنامہ رہنمائے دکن ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا، اس کے مدیر محمد منظور حسن اور مالک سید محمود وحیدالدین تھے۔ ۱۹۷۶ء میں اس اخبار کی ذمہ داری سید لطیف الدین قادری کے ہاتھوں سونپی گئی۔ ۱۹۸۴ء میں ان کے انتقال کے بعد مشہور صحافی سید وقارالدین کو اس کی ادارت سپرد کی گئی، آج بھی یہ اخبار مسلسل شائع ہو رہا ہے، تاہم آخرالذکر کے تین اخباروں کے مقابلے میں اس کی زیادہ شہرت ومقبولیت نہیں ہوسکی۔ رہنمائے دکن کا ادبی ایڈیشن ''گلستاں'' بھی نکلتا ہے، جس میں اردو ادب پر تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

حیدرآباد میں اور بھی بہت سارے اخبارات ہفتہ روزہ، پندرہ روزہ اور روزنامے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں، جن میں راشٹریہ سہارا، شمس ٹائمز، صحافی دکن، گواہ، صدائے حسینی، سفیر میل، وقار ہند، مہنگائی اور انکشاف وغیرہ ہیں، یہ سبھی اخبارات زیادہ مشہور ومعروف اور مقبول نہیں ہیں، ان میں کئی اخبارات پابندی سے شائع بھی نہیں ہو رہے ہیں۔

مولانا افتخار رحمانی۔ نئی دہلی

منصورِ ہند صوفی سرمد شہیدؒ: کتابِ زیست کے چند گم شدہ اوراق

یہ کیسی عشق کی افتادگی اور سرخیزی تھی کہ دار و رسن سے انسان خوف زدہ ہوتا ہے؛ لیکن سرمد اس سے خوش ہو رہا ہے، یہ کیسا جنون تھا کہ سرِ دار بھی مسکرا رہا ہے۔ انسان موت سے ڈرتا ہے؛ لیکن سرمد خوشی سے جھوم رہا ہے، نغمہ زن ہے اور وصل کی شادکامیوں کے تصور سے محظوظ ہو رہا ہے۔ یہ عشق کی سرمدیت اور اس کی جاودانی تھی ورنہ تو عامۃ الخلق موت سے لرزاں ہوا کرتی ہے۔ سرمد کی سرمدیت ہی تھی کہ وہ عشق کی مئے ہلاہل پی کر گمنام نہ ہوا؛ بلکہ 'جاوداں' ہوگیا۔ جلاد آیا تو سرمد یہ کہ ٹھٹھرتا بجائے اس کے، وہ مسرور ہوا اس کی مسرت بھی مطلوبہ تھی؛ کیوں کہ اس نے تو ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ

"بیہودہ چرا در طلبش می گردی؟
بنشیں! اگر او خدا ست خود می آید"

اور قضا کا پروانہ لیے اس کا محبوب اس کے سامنے کھڑا تھا، جلاد جب قریب آیا تو سرمد نے جھومتے ہوئے کہا "فدائے تو شوم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم"۔ اور یہ نعرۂ فنا لگاتا بھی کیوں نہیں؛ کیوں کہ اس کا یہی مسلک جو ٹھہرا۔ مولانا آزاد آگے لکھتے ہیں:

"جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا: "فدائے تو شوم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم" صاحب مراۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دے دی۔

"شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم"

جس خاک (سرمد) میں ایک برہمن زادہ (ابھے چند) نے آتش فروزاں کی تھی، وہ خاک (سرمد) مجاز کی راہوں کو ٹھکراتا ہوا حقیقت سے یوں ہم عنان ہوا گویا تقسیم ازل کے ہجر کو وصل کی شادکامیاں نصیب ہوئی ہوں۔ سرمد خاک و خون میں تڑپتا رہا اور یوں جان دے دی کہ جان دینا بھی اسی کافرِ عشق کے رہینِ منت ہو۔

"بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

سرمد نے ہنستے، مسکراتے اور وصل کی شادکامیوں کے نغمے گاتا ہوا دار و رسن کو چوم لیا، سرمد کا کون تھا جو آہ و بکا کرتا، نہ اولاد، نہ ماں باپ، نہ کوئی رشتہ دار، اور پھر اس پردیسی تاجر کا اِس پردیس میں کوئی کیوں کر ہوگا کہ جس نے متاع دنیوی کے عوض متاع ابدی اور سرمدی کا سودا کرلیا ہو۔ کوئی اس کا تھا بھی نہیں جو اس کے قتل کے خلاف آواز بلند کرتا، عوام اور اس صوفئ حال مست کے معتقدین اقتدار کے خوف سے آواز بلند بھی نہیں کر سکتے تھے، ایک اس کا معتقد تھا، داراشکوہ۔ وہ بھی اپنے بھائی کے خلاف جنگ کر کے ابدی نیند سو چکا تھا۔ اور کوئی بعید نہیں کہ تاریخ نویسوں نے بھی سرمد کے متعلق حق بیانی یا اس کے احوال کے تئیں خامہ فرسائی نہیں کی؛ کیوں کہ عتابِ عالمگیری کا خدشہ ان کے روح کو لرزاں کر دیتا ہوا اور پھر 50 سال تک اورنگ زیب اقتدار پر متمکن بھی رہے، بنابریں یہ بھی گمان غالب ہے کہ تاریخ نویسوں کو اقتدار کے خوف نے

پچاس سال تک زبان بندی پر مجبور رکھا۔ اس لیے بھی سرمد نصف صدی تک کے لیے گوشتہ گمنامی میں چلے گئے اور پھر رفتہ رفتہ منظر نامہ سے ہی غائب ہو کر رہ گئے۔ ہاں البتہ ان کی قبر جامع مسجد کے بائیں مشرقی جانب عشق کی یاد کو ہر زائر اور مسافر کو یاد دلاتی رہتی ہے بقول حافظ شیرازی۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ ٔعالم دوام ما

صاحب مراۃ الخیال کی عالمگیر کی خوشامد کی تنقید کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

"صاحب مراۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا؛ لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خون ریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب وفضائل میں جگہ پائے، حالاں کہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے۔ اس کو بھی عشق ہی کی شیوہ گری سمجھئے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم وخونی ہونے کی جگہ تحسین وثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدان عشق بھی قربان گاہ "منیٰ" ہے کہ جس قدر بھی خون بہائے، عین ثواب ہے۔

"یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب الٹا"

مولانا آزاد نے سرمد کی قبر کے متعلق جو بیان کیا ہے اور لوگوں کے درمیان پھیلی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم یہ بھی قدرت کا ہی کرشمہ کہہ لیں کہ سرمد کے متعلق اس طرح افراط و تفریط سے پاک مفصل احوال قلم بند کرنے والے کا بھی مزار اسی سرمد کے مزار سے متصل دس قدم کی دوری پر واقع ہے۔ مولانا آزاد باغ میں محوِ استراحت ہیں جب کہ سرمد فقیر اصلی بن کر یوں ہی سرِ راہ خاک ڈالے خونیں رنگ کے بنے ہوئے خونیں مزار میں سویا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا مدفن نہیں صرف مشہد ہے؛ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کردی ہے کہ: "در جنب مسجد جامع گردن اورا زدند و در ہماں جا دفن کردند" یہ مقام موجودہ مقام (مزار) کے سوا اور کون سا ہوسکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ: "راقم حروف بہ زیارت مزار وے مکرر مشرف شدہ ام، در چہار فصل سبزہ از تربتش کم نہ می شود۔ والحق فیض عجیبے و زیارت آں منصور ثانی ہست"۔ والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے؛ لیکن آج بھی مشہد زیارت گاہ عوام وخواص ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اس کے آگے رو بہ آسمان رہتے ہیں۔

"بہ سر تربت حافظ چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہہ رندان جہاں خواہد بود"

مولانا آزاد نے والہ داغستانی کے قول کے بموجب مزار سرمد کی نشان دہی کی ہے آج جب کہ سرمد کو شہید ہوئے کئی صدی گزر چکی ہے، مغلیہ سلطنت کو زیر وزبر ہوئے بھی ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، اب اس کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں، جن پر ہندو روسیاہ ولعین اقتدار کے نشہ میں دھت ہو کر اپنا دعویٰ پیش کرتے ہیں؛ لیکن قدرت کی یہ بھی کاریگری دیکھ لیں کہ جس طرح اس نے اپنے گھر (جامع مسجد) کی حفاظت کر رکھی ہے، اسی طرح اپنے عاشق زار کی تربتِ ناز کو بھی زمانہ کے حوادث سے باقی ومحفوظ رکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مخلوق کی بیہودہ عقیدت مندی نے سرمد کے مزار کو کسی "شوالہ" سے زیادہ کا رتبہ دے رکھا ہے، لال دھاگے اس کے مزار کی کھڑکیوں سے جا بجا بندھے ہوئے ہیں، پیر و جواں، مرد وخواتین بلاتفریق سرمد کے محبوب حقیقی کا سجدہ وکورنش بجالانے کے سرمد کے مزار کا ہی سجدہ کر رہے ہیں جو کم از کم میرے لیے یہ بات سخت ناگوار ہے اور شاید اسی توحش کی وجہ سے اس کے مزار کے قریب نہ جا سکا۔ دل نے چاہا کہ قریب جاؤں؛ لیکن طبیعت کے تصلب اور تربیت کے تقشف نے مجھے قریب جانے سے باز رکھا، ہاں البتہ دور سے ہی

مزارِ ناز پر فاتحہ پڑھ لینا غنیمت سمجھا۔ مجاور نے جب شکلاً دوُ دیوبندیوں' کو مزارِ سرمد کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور اس کے متعلق آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے اندر آنے کی خواہش کی؛ لیکن معذرت کے ساتھ 'شکریہ' کہہ دینا پڑا۔ دراصل ہماری ابتدائی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے، اس ماحول میں اولیاء کو بس ولی تک ہی سمجھا گیا، کبھی حاجت روانہ سمجھایا گیا، فقیر کو فقر و فاقہ مستی کی صورت تک ہی مناسب سمجھا۔ تصوف کے لیے ایسے رہنما خطوط متعین کیے ہیں کہ اگر کوئی بھی اس سے سر مو بھی انحراف کرے تو وہ شریعت کے خلاف نفس پرستی پر عمل پیرا سمجھا جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی مجددانہ ہستی ہے کہ جن کی خانقاہ (تھانہ بھون) میں تمام مکروہات کا گزر نہیں تھا؛ بلکہ اخلاق وآداب کے تئیں بھی وہ سختی کے ساتھ پابندی کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کے مزارات شرک وعبادات کی کثافتوں سے الحمدللہ پاک ہیں۔ سماع، رقص اور دیگر عجمی صوفیاء کے لوازمات کو حرام تصور کیا گیا جس کے مثبت نتیجے سامنے آئے۔ الغرض اہل دل سے رشتہ اور ان سے مناسبت وارادت رشتۂ اسلام کا تقاضا ہے، اس لیے بھی مجھے ان فقیروں اور درویشوں سے قلبی لگاؤ ہے۔ اور یہ بھی کہہ لیجیے کہ کم از کم برصغیر کے مسلمانوں کی خوش قسمتی کے ساتھ بد نصیبی بھی ہے کہ انہیں صوفیاء کے ذریعہ اسلام کی معرفت ہوئی، بنابریں وہ صوفیاء سے تعلق، عقیدت اور محبت ایمان کی حد تک رکھتے ہیں۔ پھر ابلیس کی تلبیس نے اپنا کام کر دکھایا کہ ولیوں اور فقیروں کے مزارات کا سجدہ کرا کر ہی دم لیا۔ عقیدت کی شدت؛ بلکہ حد درجہ کور مغزی اور جہالت کہہ لیں کہ اگر کسی نے ان خلاف شرع امور پر نکیر کی تو وہ 'منافق'، 'زندیق'، 'کافر'، 'مرتد' قرار پایا، جب کہ ولیوں سے عقیدت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہے۔

خیر، بات کہیں اور نکل گئی۔ دمِ آخریں عشق کی شورشوں میں گم رہنے والے، دیدارِ شاہدِ ازلی میں مستغرق کو کیا اس محبوب کا کلمہ پڑھنا نصیب ہوا تھا یا نہیں؟ وہی کلمہ جس کو نہ پڑھنے کی پاداش میں کندھے کو گردن کے بوجھ سے ہلکا کیے جانے کا فتویٰ ظاہر پرستوں نے دیا تھا؟ کیا یہ مشکل ہے؟ شاید نہیں، جس محبوب نے اپنی 'لگی' کسی کو لگا دی ہو، جس نے نگاہ ازل سے جگر کو ہمیشہ کے لیے خوں فشاں کر دیا ہو اور جس معشوق نے عاشق کا امتحان دل کے بجائے گردن لے کر کیا ہو، کیا وہ معشوق اسے اب بھی دنیا کے سامنے شرمندہ کر سکتا ہے؟ اس کا جواب مولانا آزاد نے یوں دیا ہے، مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"خلیفہ ابراہیم جن کے حالات اوپر گزر چکے ہیں، راوی ہیں کہ سرمدؔ نے زندگی میں کلمہ طیبہ "لا الٰہ" سے زیادہ نہیں پڑھا؛ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا کہ سرکشتہ سے تین بار "الا اللہ" کی صدا بلند ہوئی، اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ: "ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمدؔ کا سر مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا رہا اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ کچھ دیر مصروف حمدِ الٰہی بھی رہا"۔ موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے؛ لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا؛ کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟۔ ہم نے بہار میں شگفتہ وشاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے، پھر اگر ایک شہید عشق کے سرِ مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمدؔ کے بے جان سر سے آواز نکلی، مگر اربابِ بصیرت نے اس کی زبانِ حال کو تو ضرور متکلم دیکھا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے، ہمارے کانوں میں تو اب تک مشہدِ سرمدؔ سے صدا آ رہی ہے کہ

"کس چہ داند مردن ہائے عشق
منت ایں مرگ بر جان من است"

الغرض سرمدؔ نے جس آگ سے کھیلنے کی کوشش سندھ اور ٹھٹھہ میں کی تھی؛ بلکہ اسے تو کھیلنے کی دعوت دی گئی تھی، اور وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس سے کھیلتا بھی چلا گیا، آخرش اس کا

خمیازہ اسے اپنی گردن نچھاور کر کے بھگتنا پڑا۔ اور عشق کا یہی دستور بھی ہے کہ اولاً اس کی آگ لگتی ہے، پھر یہ آگ چنگاری کی شکل اختیار کرتی ہے پھر یہی آگ اپنے سوا تمام خس و خاشاک کو خاکستر بنا کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی سرمدؔ کے ساتھ بھی ہوا۔ عشق اور عقل کی جنگ میں عشق ہمیشہ شکست خوردہ ہوا ہے۔ عشق چاہتا ہے کہ آگ نمرود میں بے خطر کود پڑے، عقل عیار ہے، سو سو بہانے تراش لیتی ہے۔ سرمد بھی اسی راہ کا رہرو تھا، اس کی کامیابی اپنی جان گنوانے میں ہی تھی، اور پھر سرمدؔ نے بصد اشتیاق کہا بھی تھا کہ

''بیہودہ چرا در طلبش می گردی؟
بنشیں! اگر او خدا ست خود می آید''

اور پھر اس کا محبوب اسی شکل میں آیا تو پھر شکوہ کس کا اور شکوہ کیوں؟ اس کی افتادگی اور رستخیزی عشق کی یہی معراج بھی تھی کہ وہ کشتہ معشوق ہو کر درجہ شہادت کے عظیم رتبہ کو پہنچے۔ حافظؔ کی زبان میں یہ شکوہ درست نہیں ہے۔

''برق عشق آتش غم در دل حافظ زد و سوخت
یار دیرینہ بہ بیند کہ با یار چہ کرد''

یہاں خود سرمدؔ کے اس رباعی کو اصل سمجھنا چاہیے کہ جس میں بصد اعتراف حقیقت خود اپنی حالت بیان کی ہے، اور اسی عشق پر قانع ہو کر دلیری؛ بلکہ پختگی کے ساتھ سرمد اپنی رباعی میں کہتا ہے:

سرمد غم ِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ ''سرمدؔ'' ہمہ کس را نہ دہند

آخری بات:

عشق اور عقل میں ہمیشہ آویزش اور حسد کی روایت برسوں سے چلی آرہی ہے؛ بلکہ تخلیق آدم سے ہی یہ کشاکش ٹھنی ہے۔ عشق کہتا ہے کہ آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے، عقل کہتی ہے کہ آگ ہے۔ عشق کہتا ہے کہ دشت و صحرا کی خاک چھانی جائے، عقل کہتی ہے دشت انسانوں کے لیے زیب نہیں۔ عشق کہتا ہے کہ گریباں چاک کر لیا جائے، عقل کہتی ہے کہ کشف العورۃ حرام ہے۔ عشق کا مطالبہ ہے کہ پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے دودھ کی نہر نکال لی جائے، عقل کہتی ہے کہ دودھ کا یوں ضائع کرنا از روئے شرع ممنوع ہے۔ عشق کہتا ہے کہ سمندر کے لطمات پیہم میں غرق ہوا جائے، عقل کہتی ہے کہ یوں جان کا گنوانا انسانی تخلیق کے منافی ہے۔ عشق کہتا ہے کہ جب تک صورت محبوب کو نہ دیکھے، اس کا کلمہ نہ پڑھو، عقل منھ زور ہو کر کہتی ہے کہ پڑھو۔ پھر اس کشاکش میں ظاہراً عاشق ناکام ہو جاتا ہے، اس کی ناکامی کا ظاہری سراپا 'سرمدؔ' ہے۔ کیا معشوق کی فتنہ انگیزی نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے ولی کامل، فقیہ العصر، خدا ترس، تصلب فی الدین میں کامل و اکمل بادشاہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے دامن پر سرمدؔ کے خون کا دھبہ لگا دیتا ہے کہ جس نے بیجا کبھی کسی دشمن پر تیر و سنان تو کجا انگلی بھی نہ اٹھائی ہو۔ جس نے سانس بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے میدان کارزار میں لیا ہو۔ جس نے انتظام سلطنت و رعایا کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہوگئی ہو۔ خود اورنگ زیب عالمگیر ٹوپی سی کر اور قرآن پاک کی کتابت سے دو وقت کی روٹی کماتے تھے؛ لیکن ملکی خزانہ سے ایک پائی بھی لینا گوارہ نہ کیا ہو۔ شریک حیات دن رات چکی پیستی تھی، ہاتھ چھل گئے، بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ دنیا دار نہیں تھا، فوراً حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سنت یاد دلاتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔ اس شخص کے دامن پر ایک بے ضرر انسان کے خون کا دھبہ لگا دیا، یہ بھی کسی معمہ سے کم نہیں۔ یہ عشق و عقل کی آویزش کا نتیجہ ہے اس جنگ میں عشق تو کامیاب ہو گیا؛ لیکن عقل (اورنگ زیب عالمگیر) جس کو ظاہری احکامات پر عمل کرنا تھا وہ عوام کی نظروں میں مطعون و رسوا ٹھہرے۔ اس جگہ یعنی عشق و عقل کی کشاکش میں نہ تو انسانی عقل کام کرتی ہے اور نہ ہی نقل و روایت سود مند ثابت ہوتی ہے۔ آخر اس قتل کا ذمہ دار کون ہے یہ سوال ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اس کے تئیں غور و خوض کے بعد کئی نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ تاہم جوش جذبات

میں آکر جس اورنگ زیب کو مولانا آزاد نے مطعون قرار دیا تھا، تاہم اسی ذکر کے آخری پیراگراف میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کا دفاع بھی کیا ہے، مولانا آزاد علیہ الرحمہ پہلے تو جذبات کی رو میں بہتے ہوئے بہت ''کچھ'' کہا ہے، پھر دانش مندی سے اورنگ زیب کا دفاع بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

''یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پیغام اجل بھی آیا تو عالم غربت و پریشانی میں، مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لیے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس، ظنون، اور شخصی آراء کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے۔ کسی کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالمگیرؒ کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگان عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مند جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ان کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔ جب سرمد نے جلاد سے کہا کہ ''تو بہر صورتے کہ می آئی من تراخوب می شناسم'' تو اسے عالمگیر اور عالمگیری علماء سے کیا شکایت ہوگی؟ بات یہ ہے کہ دیار محبت میں انتقام و دعوے کی شنوائی نہیں اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شی حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجیے اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔

''شدست سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست''

تاہم میری نظر میں: ''کشتۂ معشوق ہونا عشق کا عین تقاضا ہے، سرمد نے جان دے کر اس تقاضے کو بھی پورا کردیا۔ سرمد کی شہادت کا کوئی ذمہ دار نہیں ہے؛ بلکہ اس شہادت کا ذمہ دار خود سرمد اور اس کی افتادگی ہے''۔ بقول جگر

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

سرمد سر دے کر سرفراز ہو گیا اور اسے یقین بھی تھا کہ اسے ایک دن سر دے کر ہی سرفراز ہونا ہے، اسی لیے تو ٹھٹھہ کے دشت و صحرا کو پامال کرتا ہوا گولکنڈہ پہنچا تھا، جب اسے کسی جہت سے گولکنڈہ میں ''سر دینے'' کا معمہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو بے اختیار کشاں کشاں شاہجہان آباد (دہلی) آ گیا۔ اسے یہاں اپنی سرفرازی نظر آ گئی تھی، دارا شکوہ اپنے بھائی کے ساتھ معرکہ میں قتل ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی اس نے یہاں سے ٹلنا گوارہ نہ کیا، گرچہ دارا شکوہ کے کئی مقربین دہلی سے کوچ کر چکے تھے ؛لیکن سرمد دہلی سے ٹلا نہیں ؛ کیوں کہ اس نے اپنی سرفرازی اسی خاک میں محسوس کر لی تھی، سرمد والہانہ انداز میں کہتا ہے اور اس کا یہ بانکپن دیدنی بھی ہے

از منصب عشق سرفرازم کردند
وز منّتِ خلق بے نیازم کردند
چو شمع درایں بزم گدازم کردند
از سوختگی محرمِ رازم کردند

حافظ نے اس تعلق سے بہت ہی عمدہ ترکیب بیان کی ہے، عشق کیجیے، مگر مئے عشق چھپ کر پیجیے! ورنہ ظاہر پرستوں کے کفر کے گولے تعاقب کریں گے؛ کیوں کہ مئے عشق چھپ کر ہی پی جاتی ہے اور پھر جب اس کا نشہ چڑھ جاتا ہے تو کمال ہوشیاری سے اسے ضبط بھی کرنا پڑتا ہے اور سرمد سے ہی چوک ہو گئی تھی کہ اس نے سر عام مئے عشق پینے کی خطا کی تھی اور پھر جب اس کا نشہ سر چڑھا تو گردن نچھاور کر کے ہی اس کافری سے نجات پائی۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

دانی کہ چنگ وعود چہ تقریر می کنند
پنہاں خورید با کہ تکفیر می کنند

(نوٹ: یہ مکمل مضمون 'حیات سرمد' مؤلفہ مولانا ابوالکلام آزادؔ نامی کتابچہ کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے، تمام حوالہ جات اسی کتابچہ سے ماخوذ ہیں)

ڈاکٹر مختار احمد فردین رحیدر آباد

زید انوار محمد فکر و نظر کے آئینہ سے

میں اپنے فن کی بلندی سے کام لے لوں گا
مجھے مقام نہ دو میں مقام لے لوں گا

ڈاکٹر مختار احمد فردین شخصی خاکہ کیلئے بہت کم قلم اٹھائے ہیں، دوستوں کی فہرست اور اوراق کو کبھی کبھی فرصت کے خاص لمحے میں دیکھا کرتا ہوں، ادھر چند سالوں سے سوشل میڈیا کا بھوت نے ہم سے جیسے بہت کچھ چھین لیا ہو، برسوں پہلے میں اپنے کلاس میٹ خورشید اکرم زبان وادب کے آئینہ میں لکھا تھا، آج پھر خیال آیا کہ ایک شخص کے بارے میں کچھ لکھوں، جبکہ جانتا کچھ بھی نہیں، مگر ادھر کے دنوں میں کلکتہ کی سرزمین پر ان کی خدمات، ان کی سوچ وفکر، ملت وقوم کیلئے کرنے کا جذبہ، یہ سب کچھ بھی مجھے ان کے ہی سوشل میڈیا کے پروفائل سے ملا اور پھر ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا، ان سے ملنے کے بعد میں کچھ لمحے ضرور سوچا کہ زید انوار محمد کے اندر اہم خوبیاں اور جذبۂ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور بے انتہا ایک دوسروں سے محبت کرتے ہیں، حالانکہ میری ملاقات کا وقفہ ان سے مختصر، مگر شخصیت جو اثر چھوڑ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے انسان مسافر ہے اور آتے جاتے رستے میں اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے، اسی مانند زید انوار محمد نے مجھ پر نقش چھوڑ گئے تھے اقبال حبیب کی

شادی کے موقع پر پھر ملنے کی آرزو اور حسن اتفاق کہ انہیں ہم نے اپنے دورہ کلکتہ کے موقع پر چند اہم ادیبوں اور اردو کے سچے خدمت گذاروں میں دیکھا اور اردو کے انمول رتن کا انتخاب کر رہے تھے کہ آپ بھی ایک انمول رتن مجھے دکھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ سیکڑوں اردو کے ریسرچ اسکالرس، اردو کے خدمت گذاروں کی فہرست میں آپکا نام بھی شامل ہو گیا، اور ایک شام جو خصوصی نشست میرے نام ڈاکٹر مختار احمد فردین کے نام رکھی گئی تھی، وہ حسین شام زید انوار محمد کے نام انمول رتن سے جشن زبان وادب میں زید انوار محمد کے خدمات، دانشوروں نے ڈھونڈ نکالا اور شہر کلکتہ کیلئے آپ کی شخصیت گوہر نایاب سے کم نہ تھا۔

آیئے چند اور خاکہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں، زید انوار محمد صاحب نرم گفتار شخصیت کے مالک ہیں آواز نرم ہے مگر اس بلند آواز میں بلا کی جادو ہے اور حکیمانہ اثر رکھنے والی باتیں، انکے لہجے کی بات ہم کریں تو دل کھولکر ان سے باتیں کر سکتے ہیں، سانولہ رنگ میری ہی طرح دراز قد، صحت مند جسم، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، جس سے علم کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، علم وادب کے شیدائیوں کیلئے تو بہت ہی متاثر کن پرسنالٹی آپ کہہ سکتے

ہیں، ان کی شخصیت سے میں کیوں اس قدر متاثر تھا مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی، مگر پھر بھی قلم کچھ لکھنے پر آمادہ، اور ملاقات کے چند مہینے کے بعد آج جب قلم اٹھائیں ہیں اور لکھنے بیٹھا ہوں تو پھر بات کہاں سے شروع کروں اور کہاں تک لکھوں اس کا تعین کرنے کی کوشش کیا، مگر قلم چلتا گیا۔

اب آئیں دیکھیں ان کا ایک اور پہلو، زید انوار محمد صاحب چیئرمین احمر فاؤنڈیشن کلکتہ کے تمام حلقوں میں انہیں شاندار پہچان اور تمام محفلوں میں آپ کی قدر و منزلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے حسن سلوک اور اخلاق نے کلکتہ شہر کے تمام شعبے حیات کے لوگوں کو متاثر کیا صرف اردو والوں میں آپ کی شخصیت قابل ستائش نہیں ہیں بلکہ آپ تمام قسم کے کلچرل ایونٹس اور سیاسی سرگرمیوں کو بھی جگہ دے رکھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کامیاب ترین بزنس مین کیساتھ ہمدردی و کشادہ دلی زید انوار محمد کی شخصیت میں خوب پائی جاتی ہیں وہ چاہے اپنوؤں میں، دوست احباب ہوں یا طالب علم، سماجی جہد کار، ادیب، شاعر، صحافی، سیاستداں، آپ ہر کسی سے دل کھول کر مدد کرتے ہیں اور ملتے ہیں دل وجان سے، بند مٹھی کا ذکر آپ نے سنا ہوگا، یہاں بند مٹھی کے بادشاہ جیسے فقیر ہیں، زید انوار محمد صاحب کا حسن سلوک نہایت ہمدردانہ ہوتا ہے اور وہ ہر ضرورت مند کی انکار کے حد تک مدد کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، ان سے گفتگو کے دوران اور دوران تقریر میں دیکھا کہ بڑی گہری نظر وفکر ہے سماجی حالات اور ملک کے سیاسی حالات پر، زبان کی حفاظت اولین ترجیح ہے، کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے کے بعد آپ اب ملک وقوم کی خدمت کیلئے اپنا قیمتی وقت دینا چاہتے ہیں، بندہ ناچیز کی تہنیتی تقریب میں ہم نے جو کچھ محسوس کیا آج اس پر اظہار خیال کرنے کی جرأت کی ہے۔ انہیں مشورہ دیا گیا کہ شہر کلکتہ میں ایک رول ماڈل اسکول قائم کریں اور یہاں سے جو طلباء وطالبات نکلیں گے وہ اپنی زبان وادب اور روشن مستقبل کا پرچم لے کر پوری دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائیں گے جو پرچم عین ممکن ہے کہ چیئرمین احمر فاؤنڈیشن کا ہوسکتا ہے۔

کلکتہ شہر میں ایک شخص اتنا کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا ہے اور اس جذبہ کو سلام کرتے ہوئے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے لگا ہوں کہ اگر زید انوار محمد صاحب کو ان سے اگر سیاسی خدمات لیں اور انہیں سیاسی خدمات کیلئے موجودہ سیاسی پارٹی میں اگر مناسب جگہ دیا جائے تو ممکن ہے کہ ملک وقوم کیلئے اور نمایاں خدمات انجام دے پائینگے، آج ملک کے حالات اور سیاسی حالات کا تجزیہ کریں اور دیکھیں تو لوگوں کے اندر سے جذبۂ انسانیت اور حقوق العباد اور انسانی خدمات سے لوگ خالی خالی ہیں، بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں اور ہوتے ہیں جن کے اندر قوم وملت اور ملت کے تعلیم کی فکر ہوتی ہے، زید انوار محمد صاحب کو آنے والے دنوں میں سیاسی دنیا کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، اور ان کا سیاسی مقام سیاست میں حاصل کیا جاسکتا ہے، ہم ان میں روشن مستقبل کے آئینہ کو دیکھتے ہیں، اور ممکن کے جب انسان کو اپنی پسند کا مقام اور فیلڈ مل جاتا ہے تو پھر وہ بہت کچھ کرنے کے عزم اور حوصلہ کو کامیابی سے حاصل کر لیتا ہے، میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں اور ہم اس بات سے پر امید ہیں کہ زید انوار محمد صاحب چیرمین احمر فاؤنڈیشن ملک وقوم کی خدمات کیلئے فاؤنڈیشن رکھتے ہیں کامیابی حاصل کریں گے، زید انوار محمد صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی کام کا بیڑہ اٹھاتے ہیں تو وہ چاہے کوئی علمی، سماجی کام ہو یا صحافتی کام اس کو بڑی دل جمعی، محنت ولگن اور پلاننگ کیساتھ کرتے ہیں۔

نئے نظام سے مطمئن طبیعت ہے
اک انقلاب کی دنیا کو پھر ضرورت ہے

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

علامہ شبلی اور مدارسِ اسلامیہ کا نصاب و نظامِ درس

۲۔اسلام کی حفاظت:

مدارس اسلامیہ کے قیام کا مقصد ہی یہی ہے کہ اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ انجام دیا جائے؛ مگر شبلی حفاظت اسلام کے کام کے اس دائرے کو کافی وسیع کرنا چاہتے تھے؛ اسی وجہ سے وہ ایسے فضلا تیار کرنا چاہتے تھے جو اسلامی لٹریچر کو انگریزی زبان میں منتقل کر سکیں؛ تاکہ نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام کو غیر مسلموں کے انگریزی ترجموں کے ذریعے سمجھنے کی وجہ سے اسلام سے دور نہ ہوجائے۔ شبلی کی یہ بھی خواہش تھی کہ علما کی طرف سے فقہ کا انگریزی ترجمہ کیا جائے؛ تاکہ عدالتوں میں ہمارے وکلا مسئلے کی صحیح تفہیم کے ساتھ بحث کرسکیں اور عدالتوں سے ہمارے خلاف فیصلے نہ آسکیں۔ شبلی کا یہ بھی خواب تھا کی فضلا کے اندر اتنی صلاحیت ہو اور ہندی و سنسکرت کی اتنی قابلیت ہو کہ وہ شدھی تحریک کا مقابلہ کرسکیں اور آریوں کی فتنہ انگیز تحریکوں کی بیخ کنی کر سکیں اور مسلمانوں کو ارتداد سے محفوظ رکھ سکیں، یہی وجہ ہے کہ جب شدھی تحریک نے زور پکڑا اور اس کے مقابلے کے لیے خاطر خواہ افراد میدان میں نہیں آئے تو شبلی نے غضب آگیں لہجے میں فرمایا کہ ندوہ کو آگ لگادو اور علی گڈھ کو پھونک دو۔ (دیکھیے: خطبات شبلی: ۱۱۸)

۳۔اسلام کی ترجمانی:

علما انبیا کے وارث ہیں؛ لہذا علما کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دین حق کا پرچار اور اسلام کی ترجمانی کریں، علامہ شبلی فضلا کی ایسی کھیپ تیار کرنا چاہتے تھے جو وسیع پیمانے پر اسلام کی ترجمانی کا عظیم کارنامہ انجام دے سکیں، ایک مرتبہ امریکہ میں مذہبی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں دنیا کے دیگر مذاہب کے نمائندوں نے اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی؛ مگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی نمائندہ وہاں نہیں پہنچا، اس واقعے کی اطلاع جب شبلی کو ملی تو انھوں نے اپنے غصے کا یوں اظہار کیا:

”کیا فائدہ اس تمام تعلیم سے جو دنیا میں دی جارہی ہے؟ کیا فخر کرسکتے ہیں ترکوں پر اس بات کا کہ وہ یورپ کے علوم وفنون جدیدہ سیکھ رہے ہیں؟ بھاڑ میں جائیں یہ علوم فنون جدیدہ، جب انھوں نے یہ قابلیت پیدا نہیں کی کہ وہ ایک ترک کو امریکہ بھیج سکتے، جو امریکہ جاکر ان کی زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم وتلقین کرسکتا، کیا ہمارے علما سبکدوش ہوسکتے ہیں اپنے اس فرض منصبی سے؟ اپنی منطق سے، اپنے حیلے سے، اپنی حجتوں سے ہم کو مجبور وزیر کرسکتے ہیں؟ گذر گیا وہ زمانہ اندھیر کھاتے کا، اب ممکن نہیں کہ دنیا ان ضرورتوں کو محسوس نہ کرے، اگر ہمارے پیشوایانِ دین ان ضرورتوں کو رفع نہ کریں گے اور علوم وفنون جدیدہ نہ سیکھیں گے اور ان زبانوں کو نہ حاصل کریں گے اور اب بھی یہ فتوی جاری رکھیں گے کی ان زبانوں کا سیکھنا ناجائز ہے، تو ان کو منصب مقتدائی چھوڑ دینا چاہیے اور علی حدہ ہوجانا چاہیے“۔

۴۔قرآن کو اس کا مستحق مقام دینا:

قدیم نصاب میں قرآن کریم سے بہت کم اعتنا کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے معانی قرآن کا احاطہ، مضامین قرآن سے گہری واقفیت اور قرآن فہمی کی صلاحیت سے فضلا کافی دور رہتے تھے، علامہ شبلیؒ اس نقص کو نصاب تعلیم کا سب سے بڑا نقص سمجھتے تھے، اور قرآن کو اس کا مستحق مقام دلانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نصاب میں تفسیر اور علوم قرآن کی کئی کتابوں کا اضافہ کیا، نیز قرآن کا سبقا سبقا درس بھی شروع کیا، شبلی بلاغت اور ادب عربی پر بھی اسی لیے زور دیتے تھے کہ اس سے قرآن فہمی کی صلاحیت صیقل ہوتی ہے۔

۵۔تحصیل فن:

مسلمانوں کی طرز تعلیم اور نصاب تعلیم میں جو نقص اساسی حیثیت کا حامل ہے اور جس کے بطن سے کئی نقائص پھوٹے وہ ہے فن کے بجائے کتاب کا مقصود ہوجانا، یہ نقص بہت پرانا ہے،

علامہ ابن خلدون نے بھی اس پر نکیر کی ہے، علامہ شبلی پوری زندگی اس کی اصلاح کی آواز اٹھاتے رہے، چناں چہ ندوہ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ:۱۹۱۴) سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''طرز تعلیم میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اصل فن کے بجائے کتاب کے ساتھ اعتنا کی جاتی ہے''۔ (خطبات شبلی:۱۹)

اسی تقریر میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''تعلیم میں دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے: تحصیل فن، امعان نظر اور قوت مطالعہ۔ نصاب موجودہ میں دوسرے امر کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور پہلے مقصد کی طرف کم توجہ دی گئی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں (بہ شرطے کہ تحقیق کے ساتھ پڑھا ہو) قوت مطالعہ، دقت نظر، احتمال آفرینی یہ تمام صفتیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں؛ لیکن کسی فن میں کمال نہیں ہوتا''۔ (خطبات شبلی:۲۰)

یہ وہ چند اہم مقاصد ہیں جو علامہ شبلیؒ کے مکتوبات، مقالات، خطبات وغیرہ میں موجود ہیں، علامہ شبلی نے نصاب میں اصلاح واضافہ کی جو آواز اٹھائی تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ قدیم نصاب کو ناکارہ اور از کار رفتہ سمجھتے تھے، یا قدیم نصاب سے انھیں نفرت تھی، یا جدید تعلیم کے مقابلے میں قدیم تعلیم کو وہ فرسودہ خیال کرتے تھے، یا ندوہ کو علی گڈھ میں ضم کر دینا چاہتے تھے، یا فضلا کو دنیادار بنانا چاہتے تھے، یا مذہبی جذبات کو سرد کرنا چاہتے تھے، یا مدارس کو ان کے مقصد اساسی سے ہٹانا چاہتے تھے، ہرگز نہیں؛ بل کہ اس کے برعکس وہ قدیم نصاب کو بھی کارآمد سمجھتے تھے، اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کرتے تھے؛ چناں چہ وہ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں:

''اس سے میرا مقصد خدانخواستہ قدیم عربی مدارس کی تنقیص اور تحقیر نہیں ہے، وہ مدارس ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، عام لوگوں میں نماز روزہ کا جو چرچا ہے، مساجد میں جو رونق نظر آتی ہے، دیہات اور قصبات میں جس قدر لوگ اسلام سے آشنا ہیں سب انھی مدارس کا فیض ہے؛ بل کہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان قدیم مدارس نے جن کاموں کو لے رکھا ہے ان کے سوا اور جدید ضروریات پیدا ہو گئی ہیں اور چوں کہ ایک ہی جماعت ہر کام کو انجام نہیں دے سکتی اس لیے ایسے گروہ کی بھی ضرورت ہے جو ان نئی ضرورتوں کو انجام دے''۔ (خطبات شبلی:۱۰۰)

علامہ شبلیؒ کو قدیم مدارس کے نصاب ونظام تعلیم سے اختلاف ضرور تھا، مگر انھیں قدیم مدارس سے کوئی نفرت نہیں تھی؛ بل کہ ایک موقع سے انھوں نے دیوبند کے بارے میں فرمایا کہ مجھے اس پر فخر ہے، (دیکھیے: خطبات شبلی:۱۴۱) اسی طرح علامہ شبلی قدیم وجدید کو جمع کرنے کے علم بردار ضرور تھے مگر اس میں وہ قدیم کا پلڑا بھاری رکھنا چاہتے تھے؛ چناں چہ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

''اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی...... میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں؛ تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے'' (سفرنامہ مصر وروم وشام:۵۲)

علامہ شبلی خالص دنیوی علوم کو ارتداد کا سبب گردانتے تھے، دنیا اور دنیاوی ملازمتوں کو تعلیم کا مقصد بنانے سے نالاں رہتے تھے، ان کے الفاظ میں:

''دنیا میں آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟'' (مقالات شبلی:۸/۱۵۰)

نصاب کی بابت علامہ شبلی کے جو خیالات ونظریات تھے ان سے اختلاف کیا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کسی بھی مفکر کی فکر سے سب کا متفق ہونا ضروری نہیں؛ مگر اسے کیا کہیے کہ شبلی کی نیت پر ہی حملہ کر دیا گیا، انھیں علی گڈھ تحریک کا ایجنٹ کہا گیا، ان کی تجاویز پر شک کیا گیا، ان کے نصاب کو ملحدانہ بتایا گیا، حالاں کہ شبلی نے واضح انداز میں کہہ دیا تھا کہ میں ندوہ کو علی گڈھ میں ضم ہونے نہیں دوں گا، (دیکھیے: مکاتیب شبلی:۱/۳۲۰) اور مولانا شیروانیؒ کے نام ایک مکتوب میں اپنی صحت نیت اور حسن ارادہ کا یوں اظہار کیا: ''کسی اور کی جو نیت ہو وہ ہو؛ لیکن میں ندوہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ ایک مذہبی خدمات انجام دوں۔ —— عجیب بات ہے کہ اس دور میں جس طرح شبلی کی نیت پر حملہ کیا گیا اسی طرح آج بھی اگر کوئی اصلاح نصاب کی آواز اٹھاتا ہے تو سب سے پہلے اس کی نیت ہی پر حملہ کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے مدارس اسلامیہ کے نصاب درس ونظام تعلیم میں اصلاح واضافہ کا جو خواب اپنی پلکوں پر سجایا تھا اسے شرمندۂ تعبیر

کرنے کے لیے پوری زندگی کوشش کرتے رہے، تحریک ندوہ جب شروع ہوئی تو انھوں نے اسے اپنے دل کی آواز سمجھا اور انھیں لگا کہ وہ جس کاز کو انجام دینا چاہتے ہیں اس کے لیے ندوہ ایک بہترین اور موزوں ترین ادارہ ہے،؛ چناں چہ شبلی نے اس ادارے کا دامے درمے سخنے ہر اعتبار سے تعاون کیا، اس کے لیے انھوں نے علی گڈھ جیسا کالج چھوڑا، اور حیدرآباد کی سرکاری و آصفجاہی ملازمت کو صرف ندوہ کے لیے الوداع کہا؛ مولانا حبیب الرحمان شیروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لیے میں نے کالج چھوڑا تھا، گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا‘‘ (مکاتیب شبلی: ۱/۱۵۰)

اسی مکتوب میں حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ کر ندوہ آنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’اس کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہوجائے تو ندوہ میں آجاؤں‘‘ (ایضا)

اسی طرح ایک مکتوب میں انھوں نے اپنے عزم مصمم کا یوں اظہار کیا ہے:

’’میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانے پر آبیٹھوں اور اپنی تمام عمر اس کی خدمت میں صرف کردوں‘‘۔ (شبلی کی آپ بیتی: ۱۶۶)

علامہ شبلی ندوہ کو جدید طرز پر لانے کی پوری کوشش کرتے رہے، انھیں اس پر کافی غصہ آتا کہ ارکانِ ندوہ پرانے نہج اور قدیم نصاب سے دست بردار ہونے کے لیے عملا آمادہ نہیں ہیں، چناں چہ مولانا شیروانیؒ کو لکھتے ہیں:

’’آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اس لیے؟ مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں اختلاف تھا؛ لیکن جس میں اتفاق تھا وہ کہاں ہے؟ مدرسوں کو کہیے کہ یہ کیا کررہے ہیں؟ ان ظالموں کو شرم نہیں آتی؟ افسوس! افسوس!‘‘۔ (مکاتیب شبلی: ۱/۱۵۷)

اسی طرح مدرس اعلی کو بھی خط لکھ کر ان سے باز پرس کی، مولانا شیروانی کو لکھتے ہیں:

’’میں نے مدرس اعلی دار العلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ وہاں سے جواب آیا کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا...... تعجب کی بات ہے کہ آپ کمیٹی نصاب کے ناظم ہیں اور آج تک وہی اندھیر ہے‘‘۔ (مکاتیب شبلی: ۱/۱۵۸)

ندوہ میں جدید نصاب کو جاری کرنا اس قدر مشکل تھا کہ مولانا کو خود حیدرآباد سے لکھنؤ آنا پڑا اور بہ جبر نصاب جاری کرنا پڑا؛

عثمان شاہین۔ حیدرآباد

غزل

تیری یادیں ہیں بس روشنی کی طرح
مٹ ہی جائیں گے غم تیرگی کی طرح

دن گیا سوچتا فلسفی کی طرح
رات آئی مگر اجنبی کی طرح

صبحِ کاذب سے دھوکا سحر کا ہوا
موت ہم سے ملی زندگی کی طرح

بجھ گئے جس جگہ آرزو کے دیئے
ہم وہیں سے اٹھے روشنی کی طرح

دوستی پر ہماری جنہیں ناز تھا
آج ملتے ہیں وہ اجنبی کی طرح

اب یہ عالم ہے شاہیؔن ان کے بغیر
چاندنی بھی نہیں چاندنی کی طرح

آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیمی کام شروع ہو گئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے، اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کیے۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے، اور سب حسب دل خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا ہے''۔ (مکاتیب شبلی: ۱۶۰/۲)

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شبلی کو ندوہ کی تحریک، ندوہ کے کاز اور ندوہ کے مقاصد سے کوئی اختلاف نہیں تھا، اور اختلاف ہوتا بھی کیوں کر کہ شبلی تو اسی تحریک، اسی کاز اور انہی مقاصد کے لیے اٹھے تھے، شبلی کو جو اختلاف تھا وہ ندوہ کی انتظامیہ سے تھا، وہ بھی اس وقت کی انتظامیہ سے؛ جہاں تک ندوہ کے تعلیمی ادارے کا تعلق ہے تو شبلی کو مستعفی ہونے کے بعد بھی اس سے لگاؤ تھا؛ چناں چہ استعفا کے بعد طلبۂ دار العلوم ندوہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''باوجود استعفا میری زندگی کا مقصد ندوہ ہی رہے گا اور آپ لوگوں کی خدمت نہ صرف دل سے بل کہ ہاتھ سے بھی کرسکوں گا''۔ (مکاتیب شبلی: ۳۲۲)

اسی طرح ندوہ سے الگ ہونے کے بعد بھی علامہ شبلی کی خواہش یہی تھی کہ دار المصنفین جیسا تصنیفی و تحقیقی ادارہ ندوہ کے احاطہ میں ہی قائم ہو؛ چناں چہ ندوہ سے مستعفی ہونے کے تقریباً ایک سال بعد اپنے شاگرد مولانا مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں:

''بھائی وہ لوگ دار المصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش تو یہی ہے؛ لیکن کیا کیا جائے، حال آں کہ اس میں انہی کا فائدہ ہے''۔ (مکاتیب شبلی: ۱۴۷/۲)

یہ ساری تفصیلات اس لیے ذکر کی گئیں؛ تاکہ یہ معلوم ہو کہ شبلی نے جن حالات میں نصاب کی اصلاح و اضافہ کا بیڑہ اٹھایا تھا وہ کیسے نامساعد، ناسازگار، ناموافق اور حوصلہ شکن تھے، ایسے حالات میں بھی شبلی پیچھے نہیں ہٹے، وہ اپنے مشن کو پورا کرنے میں لگے رہے، گو کہ انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، مگر انھوں نے جو کچھ کیا وہ سو سال بعد بھی اپنی معنویت رکھتا ہے، اور انھوں نے جو نقوش راہ دکھائے تھے ایک صدی بعد بھی کاروانِ علم ان نقوش راہ سے منزل کا سراغ لگا رہا ہے۔

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

انصار احمد معروفی۔ پورہ معروف مئوناتھ بھنجن (یوپی)

سائنس کے کرشمے

انمول یہ دولت ہے ، اللہ کی رحمت ہے
سائنس ہو یا حکمت نعمت ہے یہ نعمت ہے
سائنس کی دنیا میں اردو کے بھی جلوے ہیں
اپنالے سبھی خوبی ، اردو میں یہ وسعت ہے
فطرت ہو کہ صنعت ہو میدان ہے سب اس کا
تحقیق سے بڑھ کر کیا ، دولت کوئی دولت ہے
تحقیق وتدبر سے کھلتی ہیں سبھی راہیں
شاہد نہیں میں تنہا قرآں کی بھی آیت ہے
مل جائے جہاں لے لو مومن کی وراثت ہے
کھوئی ہوئی برسوں کی واللہ یہ حکمت ہے
آوازۂ ''کن فیکون'' ہر وقت یہاں گونجے
ہر موج ہے امکانی ایجاد ہی فطرت ہے
وہ قوم بھلا کیسے مفلوج ہو یا مردہ
جس قوم میں الفت ہے ہمت ہے بصیرت ہے
بغداد منور تھا یورپ تھا اندھیرے میں
روشن ہوا اب یورپ بغداد میں ظلمت ہے
مایوس ہوں کیوں احمدؔ؟ شب ہوگی گریزاں ہی
خورشید کے جلووں سے ذرے میں بھی طاقت ہے

حضرت سید شاہ میر شاہ محی الدین ثانی قادریؒ

اولیاء اللہ کا تذکرہ غوث الاعظم کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ، جن کو عرف عام میں بڑے پیر غوث اعظم دستگیر کہتے ہیں، جو آلِ نبی اور اولادِ علیؓ نجیب الطرفین سادات ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت پیر عبدالرزاق قادری کی نسل پاک سے ۷/ پوتے ارض دکن کو رونق بخشی، جن کو سبعہ قادری بھی کہتے ہیں، انہی میں حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری لااوٗبالیؒ جن کا مزار مبارک کرنول میں ہے، ان کے چوتھے صاحبزادے حضرت سید شاہ پیر شاہ محی الدین ثانی قادری حیدرآباد تشریف لائے، قدیم جو دریائے موسیٰ پر پہلا پل قلی قطب شاہ کے دور میں تعمیر ہوا تھا اور وہاں شہر کا ایک بلند دروازہ بھی ہے جو آزادی کے بعد مندر میں تبدیل ہوگیا۔ دراصل وہ ایک راستہ تھا جو پرانے پل سے گزرنے کا حضرت ثانیؒ اس کے قریب ایک غیر آباد مسجد تھی اس کے تعلق سے یہ مشہور تھا کہ رات کو وہاں سے ڈراوٗنی آوازیں آتی تھیں اور کوئی اس کے قریب سے نہیں گزر سکتا تھا۔ حضرت پیر شاہ ثانی نے اس مسجد میں قیام کیا، لوگ منع کرتے گئے لیکن آپ نے وہیں قیام کیا، صبح لوگ غلط خبر سننے کے لیے بے چین، لیکن آپ نے وہاں بلند آواز میں اذان کہی، مقامی لوگوں میں خاموشی کی لہر دوڑ گئی اور آپ کی عظمت ظاہر ہوگئی، جس کی وجہ سے لوگ آپ کے پاس ہدایت کے لیے آتے۔ رفتہ رفتہ آپ کی شہرت ہوگئی اور بادشاہ وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر فیضِ روحانی سے سرفراز ہوئے اور اسی مسجد کے روبرو آپ کے قیام کے لیے خانقاہ تعمیر کروائی۔ حضرت محی الدین ثانیؒ وہاں رشدوہدایت کے راستے پر لوگوں کو بلاتے رہے۔ ہزاروں نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور بندگانِ خدا کی خدمت میں لگے گئے۔

حضرت کی کچھ عرصہ تقریب نکاح ہوئی پھر آپ کی اولاد کا سلسلہ بڑھ گیا۔ آج درگاہ موسیٰ قادری جو میٹی ہے وہ حضرت کے پوتے ہوتے ہیں، اللہ کے فضل سے حضرت کا نسلی سلسلہ آج بھی جاری ہے، اللہ والوں کے پاس جانشین اسی کو بنایا جاتا تھا جو اس منصب کے قابل ہو۔ چنانچہ آپ کے سلسلہ میں بھی اپنے ایک خلیفہ کو جانشین بنا گیا اور آگے بڑھ کر خاندانی موسویہ کے داماد حضرت سید شاہ فضل اللہ قادریؒ کو یہ منصب ملا جو موجودہ سجادہ نشین حضرت سید شاہ محمد فضل اللہ قادری الموسوی کے نانا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جانشینی اور سجادگی کا سلسلہ جاری ہے۔

۹۲/ سال کی عمر میں حضرت محی الدین ثانیؒ اس دارِ فانی سے دارِ بقاء کی طرف کوچ کر گئے۔

Mohammed Abdul Khader　Cell : 9392492002
: 9885959976
HUSSAIN
KIRANA STORE
WHOLESALE & RETAIL
Specialist in : All Kinds of Catering Suppliers
22-3-480/482, Clock Tower Main Road,

حسین کیرانہ اسٹور ہول سیل اینڈ ریٹیل
H.K. Caterers
مین روڈ میر عالم منڈی حیدرآباد

رجسٹرڈ نمبر: 2012/885

سہارا ویلفیئر سوسائٹی حیدرآباد

پلاٹ نمبر 12 سنجیویا کالونی سکھ ویلیج سکندرآباد 50009

دیہاتوں میں مساجد اور امام و معلم کے لیے مالی اعانت کی اپیل

الحمدللہ ہم کئی سال سے صرف رضائے الٰہی وفلاح آخرت کے جذبہ کے تحت اسلام اور مسلمانوں کی خاموش خدمت کرتے آرہے ہیں۔ ہماری ٹیم شہر حیدرآباد کے اطراف واکناف تقریباً ۵۰ کیلومیٹر پر چھوٹے چھوٹے دیہات، جس میں ۱۵ تا ۳۰ مکانات مسلمانوں کے ہیں، وہاں پر مسجد نہیں اور اگر ہے تو وہاں نماز نہیں ہورہی ہے، کیوں کہ وہاں امام ومعلم نہیں ہیں، غربت کی وجہ سے ایک امام کی تنخواہ نہیں دے سکتے، جس کی وجہ سے بچوں کی تعلیم وتربیت بھی نہیں ہورہی ہے۔ ایسی صورت میں شہروں میں رہنے والے اہل خیر کی دینی واخلاق ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جانب سے ایک امام کی تنخواہ کی ذمہ داری لیں۔ شہروں میں تو عالیشان مساجد ہیں، جس کے لیے دل کھول کر خرچ کیا جارہا ہے، اس سے بھی زیادہ دیہاتوں میں خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیہاتوں میں مساجد کی تعمیر ایمان کی حفاظت کا باعث ہے۔ بعض دیہات جہاں مسجد نہیں، وہاں موذن کی اذان سننے کے لیے کان ترس رہے ہیں، ایسی جگہوں پر ایمان کی حفاظت کے اسباب پیدا کرنے اور بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کی سخت ضرورت ہے۔ دیہاتوں میں مسلمان اور مومن کی پہچان ضروری ہے۔ بعض دیہات آج بھی مساجد سے محروم ہیں۔ ان دیہاتوں میں مسجد نہ ہونے کی وجہ سے دیہاتی مسلمان غیروں کی خوشنودی کے لیے دیگر جگہوں کو اہمیت دے رہے ہیں اور غیر اللہ کی عبادت کررہے ہیں۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ان دیہاتوں میں ان پڑھ اور غریب کو جو صرف تیلگو زبان سے واقف ہیں، انہیں عربی، اردو سے واقف کرایا جائے تاکہ ان کے دین وایمان کی حفاظت ہوسکے۔ اس لیے، ہم کو چاہئے کہ محنت کی کمائی ہوئی دولت کو بے جا اسراف وخرافات پر خرچ کرنے کے بجائے دیہاتی مساجد کی تعمیر میں لگائیں۔ یہ مسجدیں قیامت کے دن ایسے مخلص لوگوں کے دین وایمان کی گواہی دیں گی۔ دیہاتوں کے ایمان کے تحفظ کے لیے جدوجہد عملاً مسلسل اور منصوبہ بند اقدامات کی ضرورت ہے۔ دیہاتوں میں مساجد کی تعمیر ومرمت کی تکمیل کے علاوہ رمضان میں کھجوروں، دال اور بقرعید کے موقع پر ہر دیہات میں ایک بڑا جانور قربانی کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتوں میں زکوٰۃ کا بھی نظم ہے، جہاں غریب مستحق نادار بیواؤں کی بھی مدد کی جاتی ہے۔ سالانہ امداد کے علاوہ شادی بیاہ اور مستحقین کی امداد کی جاتی ہے۔ جہاں پانی نہیں وہاں بورویل کا بھی نظم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بینک کے سود کی رقم بھی لے کر طہارت خانے تعمیر کررہے ہیں۔ اس لیے یہاں امداد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا اجر دینے والا ہے، ایسی جگہ کام کرنے والوں کو مالی اعانت کرکے اپنا ایمان وروحانی جذبہ پیش کریں۔

یہ سب کام اللہ کے فضل وکرم سے ملت کے مخلص اصحابِ خیر کے تعاون سے خاموشی سے انجام دیا جارہا ہے۔ ہم ابھی تک الحمدللہ ۳۵ مساجد کی تعمیر کرچکے ہیں اور ان میں امام وموذن کی تنخواہوں کا بھی انتظام کررہے ہیں اور کئی جگہوں پر کام جاری ہے اور کئی جگہوں سے تقاضا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری ایمانی قوت، دینی جذبہ کو شرفِ قبولیت اور اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

نوٹ: ہم تمام اہل خیر حضرات سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے اس کام کو ایک مرتبہ ضرور دیکھیں اور شامل ہوجائیں۔ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

رابطے کے لیے: صدر رئیس اقبال (انجینئر) 9959746500۔ نائب صدر: سید خلیل 8142506301

سید شجیع الدین ٹریزرر 9703936440۔ محمد ریاض اللہ خان ایڈوائزر 9849475561

عبدالقادر پٹیل جوائنٹ سکریٹری 9849468571۔ اعظم اعظمی فینانسیل ایڈوائزر 9705553745

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دو سال)
★ شعبہ عالمیت (چار سال) ★ شعبہ فضیلت (دو سال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔

☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

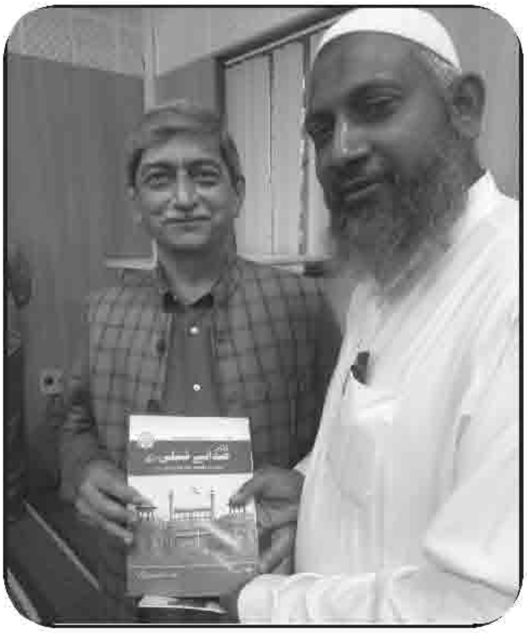

ڈاکٹر اسلم پرویز وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کو ایڈیٹر ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی ماہنامہ "صدائے شبلی" پیش کرتے ہوئے

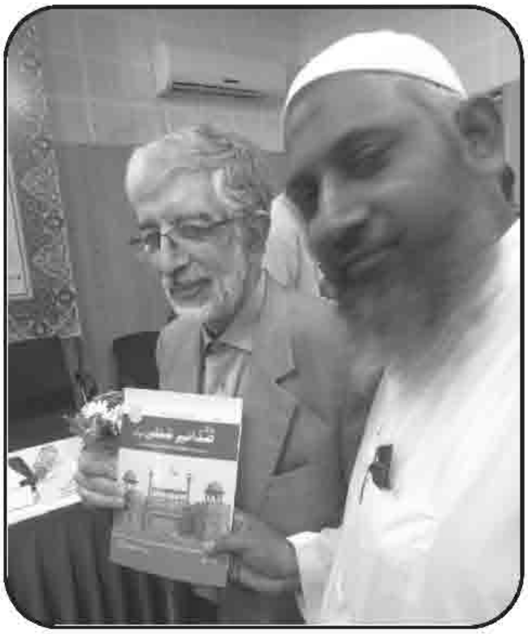

پروفیسر غلام علی حدادعادل سابق پارلیمانی اسپیکر اسلامی جمہوریہ ایران کو ایڈیٹر ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی ماہنامہ "صدائے شبلی" پیش کرتے ہوئے

EXPERT TIPS FOR STUDENTS TO SCORE MORE IN TENTH

Effective Learning strategies were promoted by team WORKOLOGIC today in Govt Girls High School Falaknuma and Maisaram, Barkas. The program was organised by Habeeb Mohsin, President, Deccan Democratic Club and Saber Yamani, All NGO GROUP.

Ms Samina Yasmeen, Director,Education & Trainings gave valuable tips through her innovative style to promote effective learning in students. Ms Samina capsuled 5R formula to help students of class tenth to face exam time staying stress free ,relaxed and confident. She asked students to read the question paper thoroughly to categorize to answering in the levels of perfection,Write legibly using simple & conceptual Language with drawings / formulas where necessary, record & manage time as well as word count, revise for correct numbering before submitting the answer script to relax.

Mr Imran Khan, Director,Trade & Trainings, Workologic initiated the session with an interactive motivational story leading the girls towards Smart work in preparing for the exams to achieve higher grades. Mr Imran emphasized on being physically and mentally healthy. He shared Learning tips to promote greater retention of knowledge Learnt and advised students to practice All in one series,work books apart from texts books and to solve previous tests papers to develop confidence,time management, fundamentals of very important concepts or major portion of syllabus.

T.Veeramani, H.M, Govt Girls High School, Falaknuma thanked Ramya Reddy, Treasurer,Deccan Democratic Club, Ms Samina Yasmeen and Imran Khan for taking this initiative to instill confidence in tenth class students..She thanked Team Workologic for their efforts in reaching the students at the right time..

Ms Sabiha, In charge, Govt Girls High school Maisaram, Barkas expressed her appreciation and hearty wishes to team Workologic .She said girls of Barkas needed such innovative and focused sessions regularly for their development.

Mr Sabir Yamani and Md Nayeemuddin efforts to execute this program are laudable.. Students were all in chears on learning new tricks for better Learning.

Team #Workologic extends it's best wishes to all the board facing students .

اسٹوڈنٹس آف دی ایئر ایوارڈ ایمن فاطمہ ساؤتھ ایشیا نے حاصل کی
واشنگٹن ڈی سی میں، گواہ بنے دنیا کے نامور صحافی ایڈیٹر پوربس میگزین

ایمن فاطمہ دختر نیک ڈاکٹر مختار احمد فردین کی ہیں، ڈاکٹریٹ آف فارمیسی کے ۵/ویں سال کی ہونہار ذہین طالبہ ہیں۔ مارکس ہمیشہ ۸۰/۹۰ کے درمیان رہا ہے، ادھر کے چند سالوں میں اس کم عمری میں کئی ممالک کا دورہ، امریکہ، یورپ، نیپال، سری لنکا اور کئی خصوصی لکچر اور اس سال Students of the year کا ایوارڈ ایمن فاطمہ Deccan College آف فامیسی کی طالبہ اور حیدرآباد کی نمائندگی کالج کے ساتھ ملک انڈیا کا نام روشن کرکے آنا، قابل فخر والدین اور کالج اور ملک کیلئے ہے۔

اسٹوڈنٹس آف لبرٹی میں ایمن فاطمہ نے اپنی محنت ولگن سے چند برسوں میں ساؤتھ ایشیا کی چیئر ویمن اور اکزیکٹو پوزیشن حاصل کرلی ہیں، ایمن فاطمہ کو اس کم وقفے میں یوں تو کئی ایوارڈس حاصل ہوئے مگر ۲۰۱۸ء سال برائے اسٹوڈنٹس آف دی ایئر ایوارڈ کیلئے ۳/ امیدوار تھے، ان میں ساؤتھ ایشیا سے ایمن فاطمہ، نارتھ امریکہ سے جسٹن انڈوشن، یورپ سے لیا جینلیڈزم اس ایوارڈ کے ۳/ کیٹگری تھے اسٹوڈنٹس آف دی ایر کیٹگری کیلئے ایمن فاطمہ کا اعلان کیا گیا اور اس طرح سے واشنگٹن ماریٹ مارکوئیش کا حال گواہ بنے اور دنیا کے ڈیلیگیٹس نے تالیوں کی گونج میں ایوارڈ کی اس اعلان کا استقبال کیا پینل جیوری میں اسٹوفاربس (Steve forbs) بھی گواہ بنے اسٹیوفاربس میگزین کے ایڈیٹر ہیں دنیا کے اتنی بڑی شخصیتوں کے درمیان ایمن فاطمہ کو اسٹیو فاربس خصوصی مبارکباد دیتے ہوئے اپنی نیک تمنائیں اور روشن مستقبل کی دعائیں دی، فاؤنڈر چیئرمین sloane frost کے ہاتھوں ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور تمام کنٹگریز کے ایوارڈ یافتہ گان نے ایمن فاطمہ کو مبارکباد دی۔

حیدرآباد اور ملک کی بھرپور نمائندگی کرکے یہ مقام حاصل کرنے والی یہ ہونہار طالبہ ایمن فاطمہ کو اہل خاندان والوں نے بھی مبارکباد پیش کئے خاص کر ڈاکٹر مختار احمد فردین نے امید ظاہر کی کہ آئندہ اور بھی بہتر کرے اس کم عمر میں دنیا میں اپنی پہچان کچھ اس طرح سے بنائی جو قابل فخر ہے۔ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد ایمن فاطمہ کے تابناک مستقبل کے لیے دعا گو ہے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

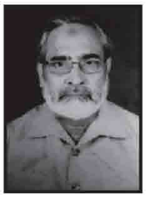

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India